

سابقہ اور موجودہ
مسلمان اُمتوں کا
ماضی، حال اور مستقبل
اور
مسلمانانِ پاکستان کی
خصوصی ذمہ داری

ڈاکٹر اسرار احمد



مکتبہ خدام القرآن لاہور

سابقہ اور موجودہ

مسلمان اہتوں کا ماضی حال اور مستقبل

اور

مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 5869501-03

نام کتاب _____ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل
طبع اول تاہفتم (اکتوبر 1993ء تا نومبر 2003ء) _____ 12,300
طبع ہشتم (اپریل 2005ء) _____ 2200
ناشر _____ ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقام اشاعت _____ 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 5869501-03
مطبع _____ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت _____ 70 روپے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض ناشر

ذیر نظر کتاب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اپریل ۹۳ء سے جولائی ۹۳ء کے دوران ”تفکر و تذکر“ کے زیر عنوان ”نوائے وقت“ میں شائع ہوئے۔ امت کی ذہنوں حالی پر ہر درد مند دل رکھنے والے مسلمان کے دل میں پیدا ہونے والی اس خلش کہ ”ہیں آج کیوں ذلیل.....؟“ کے تذکرے سے شروع ہونے والے یہ مضامین دراصل محترم ڈاکٹر صاحب کے خطبہ عید الفطر کی تفصیل و تشریح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سال یہ خطبہ غیر معمولی طور پر طویل ہی نہیں، غیر معمولی اہمیت کا حامل بھی تھا اور اس کا عنوان تھا: ”امت مسلمہ پر عذاب الہی کے سائے، مسیح و جال کی آمد آمد اور مسلمانان پاکستان کی ذمہ داریاں!“ — عید الفطر سے متعلق قبل محترم ڈاکٹر صاحب بیرون ملک سفر سے واپس تشریف لائے تھے اور ان کے اس سفر میں امریکہ، فرانس اور سعودی عرب کے ساتھ ساتھ متحدہ عرب امارات کا مختصر دورہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ اس سفر کے مشاہدات و تاثرات کا ایک عکس بھی ان کی ذیر نظر تقریر و تحریر میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

بین الاقوامی حالات جس تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں اور تاریخ جس برق رفتاری سے کروٹیں بدلنے لگی ہے، اس کے پیش نظر ملک و ملت کا درد رکھنے والا ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ امت مسلمہ اور اسلام کا مستقبل کیا ہو گا! بادی النظر میں تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ اسلام مخالف تمام قوتیں اب واحد سپر پاور امریکہ جسے ایک اعتبار سے ”سپریم پاور“ کہنا بھی غلط نہ ہو گا، کے جھنڈے تلے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف متحد ہو چکی ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ قوت و طاقت کے نشے میں سرشار اس سپر پاور کے سر پر ”یہودی“ سوار ہے جس کی مسلمان دشمنی محتاج بیان نہیں۔ اس تناظر میں صاف نظر آتا ہے کہ امت کا مستقبل نہایت تاریک ہے اور شدید اندیشہ ہے کہ دجالی فتنے کا یہ سیلاب مسلمانوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ لیکن ہمارے لئے اصل غور طلب

بات یہ ہے کہ کیا اس تاریکی کے بعد کسی روشن صبح کے نمودار ہونے کا امکان ہے یا نہیں، کیا یہ شب تاریک کبھی جلوہ خورشید سے گریزاں ہو سکے گی اور کیا کرۂ ارضی ایک بار پھر نغمہ توحید سے معمور ہو سکے گا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا ہمارے لئے یہ طرز عمل کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہیں کسی طور مناسب ہے؟ یا موجودہ حالات اور مستقبل کے حوالے سے ہم پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے؟ ان سوالات کا بڑا مفصل جواب محترم ڈاکٹر صاحب کی ان تحریروں میں موجود ہے۔ یہ مضامین دراصل سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں یعنی یہود اور امت مسلمہ کے ماضی، حال اور مستقبل کے ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب کے افکار پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ ان کے آئینہ افکار میں جو قرآن و حدیث کے نصوص پر مشتمل ہے، قارئین کو نہ صرف یہ کہ ماضی اور حال کا صحیح شعور و ادراک حاصل ہوتا ہے بلکہ آنے والے دور کی ایک واضح تصویر بھی نظر آتی ہے۔ قارئین محسوس کریں گے کہ فکری و نظری گہرائی کے حامل ان مضامین میں جہاں جا بجا دقیق عالمانہ نکات موجود ہیں وہاں عملی رہنمائی کا بھی دافرا سامان موجود ہے۔

اس کتاب میں شامل بعض مباحث اس سے قبل ”حظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر“ نامی کتابچے میں بھی شامل تھے لیکن اس کتاب کے مخصوص سیاق و سباق میں ان کا شائع کرنا ضروری تھا۔ ویسے بھی اس تحریر اور اس زیر نظر کتاب کے درمیان کم و بیش بیس سال کا فصل ہے، چنانچہ اس طویل فصل زمانی کے پیش نظر ان میں بعض نئے پہلو بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو یقیناً قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

ناظم مکتبہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ترتیب

- ☆ باب اول
۷ ہیں آج کیوں ذلیل؟
- ☆ باب دوم
۱۶ قرآن کا قانونِ عذاب
- ☆ باب سوم
سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں
۲۴ اور سابقہ امت کی دو ہزار سالہ تاریخ کے چار ادوار
- ☆ باب چہارم
۳۳ موجودہ امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے چار ادوار
- ☆ باب پنجم
۴۲ بیسویں صدی عیسوی — سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں
- ☆ باب ششم
۵۷ ابراہیمی مذاہب کا ”ثالث ثلاثہ“
- ☆ باب ہفتم
۷۱ ”آنے والے دور“ کی ایک واضح تصویر
- ☆ باب ہشتم
۷۹ اسلام کا عالمی غلبہ یا عالمی نظامِ خلافت

❖ باب نہم

۸۸

اب تک کے مباحث کا خلاصہ

❖ باب دہم

۹۵

پندرہویں صدی ہجری: توقعات اور اندیشے

❖ باب یازدہم

۱۰۹

دو شبہات اور ان کے جواب

❖ باب دوازدہم

۱۱۸

خلج کی جنگ : ”جنگوں کی ماں“؟

❖ باب سیزدہم

۱۳۲

ملت اسلامیہ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

❖ باب چھار دہم

۱۴۱

پاکستان کا مستقبل

❖ باب پانزدہم

۱۵۵

ہماری نجات کا واحد ذریعہ : اجتماعی توبہ

❖ ضمیمہ

۱۶۵

اس کتاب میں مذکور احادیث کی تخریج

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

باب اول

ہیں آج کیوں ذلیل؟

۲۲ جنوری ۱۹۳۷ء کو نیو جرسی ٹیٹ کے صنعتی شہر نینن میں خطاب جمعہ کے لئے وہیں تانا بانا بننے میں مصروف تھا کہ اچانک بجلی کوندنے کے سے انداز میں یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ ہم سورۃ البقرہ کی آیت ۱۱۱ میں وارد شدہ الفاظ ”ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ“ یعنی ”ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی“ اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!“ کو پڑھتے ہوئے اطمینان سے گزر جاتے ہیں، اس لئے کہ یہ الفاظ یہودیوں کے بارے میں وارد ہوئے ہیں، لیکن اگر موجودہ حالات کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو اس وقت ان الفاظ قرآنی کے مصداقِ کامل مسلمان ہیں نہ کہ یہود! (واضح رہے کہ ذرا سی تقدیم و تاخیر کے ساتھ یہ مضمون سورۃ آل عمران کی آیت ۱۱۲ میں بھی وارد ہوا ہے) اسی طرح سورۃ الفاتحہ کی آخری آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس امر پر مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ ”مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ“ کی عملی تفسیر یہود ہیں اور ضَالِّین کے مصداق نصاریٰ ہیں، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ مؤخر الذکر یعنی عیسائیوں کا گمراہ ہونا تو یقیناً اب بھی صد فی صد درست ہے، لیکن ”مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ“ کی عملی تفسیر تو اس وقت یہود نہیں، مسلمان ہیں!

ذرا غور فرمائیے کہ یہودی اس وقت پوری دنیا میں کل چودہ ملین یعنی لگ بھگ

لے ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَمَا تُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَخَيْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ

ڈیڑھ کروڑ ہیں جبکہ مسلمانوں کی تعداد کم از کم تیرہ سو ملین یعنی ایک ارب تیس کروڑ ہے۔ گویا مسلمان یہودیوں سے تعداد میں تقریباً سو گنا زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود اس وقت کرہ ارضی کی سیاسی قسمت بالفعل یہود کے ہاتھ میں ہے، اس لئے وہ علامہ اقبال کے قول ”فرنگ کی رگ جاں بیچہ یہود میں ہے!“ کے مصداق وقت کی ”واحد سپریم پاور“ یعنی ریاست ہائے امریکہ کی سیاست، معیشت اور ثقافت، سب پر پوری طرح قابض اور قابو یافتہ ہیں اور امریکہ کا صدر ہو یا سینٹ، اور کانگریس ہو یا میٹاگون، سب ان کے اثر و رسوخ اور بالخصوص ذرائع ابلاغ پر ان کے کنٹرول کے آگے بے بس ہیں۔ دوسری طرف سونے چاندی کی بجائے کانغدی کرنسی کے رواج اور بینک، انشورنس اور شاک ایپیچنج کے شیطانی جال پر تسلط کے ذریعے اس وقت دنیا کی دولت کے بڑے حصے پر یہود کا قبضہ ہے۔ چنانچہ ایک جانب ان میں سے بیسیوں افراد ایسے موجود ہیں جو کئی کئی بلین ڈالر کا ایک ایک چیک جاری کر سکتے ہیں، تو دوسری جانب عالمی اقتصادیات کا لیوریٹائزڈ ان کے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں مالی بحران پیدا کر کے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو ریزہ ریزہ کر دیں۔ (سوویت یونین کا یہ حشر تو سامنے کی بات ہے ہی، جیسے ہی صہیونیوں نے محسوس کیا کہ امریکہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے، وہ آنا فائبر کی معاملہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں، اور غالباً وہ وقت اب زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ واللہ اعلم!)

یہود کا یہ سیاسی اور معاشی اثر و نفوذ تو ذرا پس پردہ اور عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے، لیکن امت مسلمہ سے تقابل کے اعتبار سے یہ حقیقت تو اظہر من الشمس ہی ہے کہ عالم اسلام، خصوصاً عالم عرب کے سینے میں اسرائیل کا خنجر بالفعل پیوست ہے۔ (واضح رہے کہ دریائے اردن کے مغربی کنارے، گولان کی سطح مرتفع اور غزہ کی پٹی سے قطع نظر جس پر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل قابض ہوا، ۱۹۴۸ء میں جو ابتدائی اسرائیل وجود میں آیا تھا اس کی صورت و اقتضا بالکل خنجر کی سی ہے!) اس پر مستزاد یہ کہ دیکھنے والی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ”وسیع تر اسرائیل“ بھی بالقوہ

وجود میں آچکا ہے۔ اس لئے کہ دنیائے اسلام بالخصوص عالم عرب میں کوئی طاقت ایسی موجود نہیں ہے جو اس کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو سکے! (یہ بالکل دوسری بات ہے کہ مسیونیوں کی اپنی حکمت عملی ابھی اپنے آخری اقدام کے ضمن میں قدرے تاخیر کی متقاضی ہو!)۔

اس کے بالکل برعکس صورت حال مسلمانوں کی ہے کہ تعداد میں سوا ارب سے زائد ہونے کے باوجود طے ”کس نئی پرسد کہ بھیا کیستی“ کے مصداق بین الاقوامی سطح پر ان کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ سارے عالمی معاملات G-7 یا زیادہ سے زیادہ G-15 طے کرتے ہیں اور بین الاقوامی مسائل میں سارے اقدامات کا فیصلہ یو این او اور اس کی سکیورٹی کونسل کے پردے میں صرف امریکہ اور اس کے چند حواری (بالخصوص انگلستان اور فرانس) کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے ملکوں اور بڑی شان و شوکت کی حامل حکومتوں کے جملہ معاملات بھی کہیں اور طے ہوتے ہیں، ہماری داخلی اور خارجی حکمت عملی کہیں اور بنتی ہے، یہاں تک کہ ملکی بجٹ اور ٹیکسوں کے ضمن میں ”ہدایات“ باہر سے آتی ہیں، مزید برآں ہمارے وسائل پر بالفعل بغیر کا قبضہ ہے اور ہمارے دولتمند ترین ملکوں کی تمام دولت بھی اصلاً غیروں کے دست اختیار میں ہے کہ اگر ذرا ان کی مرضی کے خلاف ادنیٰ جنبش بھی کریں تو چشم زدن میں ان کی کل دولت اور سرمایہ ”منجمد“ کر کے گویا صفر بنا کر رکھ دیں۔ الغرض ہماری کیفیت اس وقت بالکل وہی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ایک حدیث مبارک (رواہ احمد اور ابوداؤد عن ثوبان) میں کھینچا تھا کہ : ”مجھے اندیشہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ نہایت کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود تمہاری حیثیت سیلاب کے ریلے کے اوپر کے جھاگ سے زیادہ نہیں رہے گی۔“

۱۔ عن ثوبان رضی اللہ عنہ قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : یوشک الامم ان تداعی علیکم کما تداعی الاکلة الی قصغتها فقال قائل : من قلة نحن یومئذ ؟ قال : بل انتم یومئذ کثیر ، ولکنکم غناء کغناء

ان ”لطیف“ حقائق پر مستزاد یہ تلخ واقعات تو لگا ہوں کے عین سامنے موجود ہیں کہ مغرب ہو یا مشرق، اس وقت ساری دنیا میں مسلمان شدید ترین مصائب و آلام سے دوچار ہیں۔ چنانچہ مشرق میں بھارت اور کشمیر، اور مغرب میں بوسنیا ہرزگووینا تو بالفضل ص ”ہو گیا مانند آب ارزاں مسلمان کالہو“ کا نقشہ پیش کر رہی ہے، باقی عالم اسلام بھی یا افغانستان اور تاجکستان کی طرح خانہ جنگی کے عذاب میں مبتلا ہے یا سورۃ النحل کی آیت ۱۱۲ میں وارد شدہ الفاظ ”لَيَأْسُ الْخَوْفُ وَالْجُوعُ“ کے مطابق بھوک اور خوف کے لباس میں ملبوس نظر آتا ہے، اور جہاں بظاہر ان دونوں میں سے کوئی صورت موجود نہیں ہے بلکہ دولت کی ریل پیل اور عمارتوں کی شان و شوکت یورپ ہی نہیں امریکہ کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے وہاں بھی ”ذلت و مسکنت“ کی یہ صورت تمام و کمال موجود ہے کہ بین الاقوامی سطح پر نہ عزت ہے نہ وقار، اور خود داخلی سطح پر بھی حقیقی آزادی حاصل ہے نہ واقعی اختیار۔ چنانچہ ایک جانب ”ذلت“ کی انتہا یہ ہے کہ مغرب کے اخبارات و جرائد میں ان دولت مند ترین مسلمانوں کا تذکرہ بالعموم تسمیہ اور استنزاء کے ساتھ ہوتا ہے، تو دوسری جانب

﴿السَّيْلُ وَلَيَنْزِعَنَّ اللَّهُ مِنْ صُدُورِ عِدْوِكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهْنَ﴾ قيل: وما الوهن يا رسول الله؟ قال: حب الدنيا وكرهية الموت (رواه ابو داؤد)

(ترجمہ) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قريب ہے کہ اقوام عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی جیسا کہ کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دسترخوان کی طرف بلا رہے ہیں۔“ اس پر کسی نے کہا: ”کیا اس روز ہم تعداد میں کم ہوں گے؟“ آپ نے فرمایا: ”تعداد میں تو اس روز تم بہت زیادہ ہو گے“ لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہوگی، جیسا کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا۔“ پوچھا گیا: ”اے اللہ کے رسول (ﷺ) وہن کیا چیز ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”دنیا کی محبت اور موت سے نفرت!“

”مسکنت“ اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ بھارت میں بابرہ مسجد کے گرائے جانے پر پچاس سے زائد نام نہاد مسلمان حکومتوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ بھارت کی حکومت سے یہ ہی کہہ سکتی کہ اگر مسجد فی الفور دوبارہ تعمیر نہ کی گئی تو ہم سفارتی یا اس سے بھی کم تر درجہ میں تجارتی تعلقات منقطع کر لیں گے۔ گویا عزت و وقار کے ساتھ ساتھ غیرت ملی کا جنازہ بھی نکل چکا ہے اور سوارب سے زیادہ افراد پر مشتمل عالمی ملت اسلامیہ اس وقت بالفعل ”حیث نام تھا جس کا گئی تیور کے گھر سے“ کا نقشہ پیش کر رہی ہے، تو سوچئے کہ الفاظ قرآنی ”ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَبَاءُ وَبَغَضْتُ مِنَ اللَّهِ“ یعنی ”ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے“ کے مصداق اس وقت ہم نام نہاد مسلمان ہیں، یا یہود؟

آگے بڑھنے سے قبل اس خیال کے تحت کہ مبادا مایوسی اور بددلی کے سائے زیادہ گہرے ہو جائیں، اور مبادا کسی کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو جائے کہ قرآن کے بیان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے، یہ حقیقت بیان کر دینی ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال مستقل نہیں عارضی ہے، اور مستقبل میں بالکل برعکس ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں قوموں اور امتوں کے عروج و زوال کے جو اصول اور عذاب الہی کا جو فلسفہ بیان ہوا ہے اور اس پر مستزاد احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں قرب قیامت کے جو حالات و واقعات اور یہود نصاریٰ اور مسلمانوں کے مابین آخری آویزش اور معرکہ آرائی کے ضمن میں جو پیشین گوئیاں وارد ہوئی ہیں ان کے مطابق یہود پر بہت جلد ”عذاب استیصال“ یعنی جڑ سے اکھیڑ پھینکنے والا عذاب نازل ہو گا (اس اصطلاح کی وضاحت بعد میں ہوگی) اور وہ ”عظیم تر اسرائیل“ جس کے خواب وہ عرصے سے دیکھ رہے ہیں اگرچہ ایک بار قائم تو ہو جائے گا لیکن بالآخر وہی ان کا عظیم تراجمعی قبرستان بنے گا۔ دوسری جانب پورے کرۂ ارضی پر بالآخر امت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حکومت قائم ہوگی اور اللہ کے دین کا بول بالا ہوگا، گویا موجودہ نیو ورلڈ آرڈر جو درحقیقت جیو ورلڈ آرڈر (یعنی یہودیوں کی

بالادستی کا عالمی نظام) ہے بالآخر اسلام کے ”جسٹ ورلڈ آرڈر“ (Just World Order) یعنی خلافت علی منہاج النبوت کے عدل و قسط پر مبنی عالمی نظام میں تبدیل ہو کر رہے گا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

«إِنَّ اللَّهَ ذُو لِي الْأَرْضِ فَوَازِيَتْ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَإِنَّ أَمْتِي سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا ذُو لِي مِنْهَا»

”اللہ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سیٹر کر) دکھادیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لئے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سیٹر کر) دکھائے گئے۔“

اسی طرح مسند احمد بن حنبل میں حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

«لَا يَتَّقِي عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ يَتُّ مَذْرُوءًا وَلَا وَبَرًا إِلَّا أَدْخَلَهُ اللَّهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيزٍ وَذَلِكَ ذَلِيلٌ إِمَّا يُعْزُّهُمْ اللَّهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ يَذِلُّهُمْ فَيَذِلُّونَ لَهَا»

”دنیا میں نہ کوئی ایسٹ گارے کا بنا ہو اگھر باقی رہے گا نہ کبلوں کا بنا ہو اخیرہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا“ خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ یعنی یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی تابعداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے!“

لہذا ہم الصادق والمصدق ﷺ کے فرمودات پر یقین کی بناء پر ایک جانب موجودہ عالمی نظام کے سربراہوں یعنی یہود اور نصاریٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ۔
”اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!“

اور دوسری جانب معروضی حالات کے مطالعے اور مشاہدے کے باعث جب امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹا محسوس ہو اور مایوسی کے سائے زیادہ گہرے ہونے لگیں تو۔
 ”سنہیلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
 کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!“

اور

”نہ ہو نو میدی زوالِ علم و عرفاں ہے
 امید مرد مؤمن ہے خدا کے راز دانوں میں!“
 کے مصداق ”دامانِ خیالِ یار“ کی طرح دامنِ امید پر اپنی گرفت از سر نو مضبوط کر سکتے ہیں..... لیکن علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق۔
 ”مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
 ہر زمان پیش نظر لا ینخلیف الیمینعاد دار!“
 اس آخری امید سے اپنے سینے کو آباد رکھنے کے ساتھ ساتھ دو اسباب کی بناء پر لازم ہے کہ ہم ان سوالات کے جواب قرآن کے فلسفہ و حکمت کی روشنی میں تلاش کریں کہ اس وقت۔

”ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
 گستاخی فرشتہ ہماری جانب میں!“
 کے مصداق کامل ہم مسلمان ہی کیوں بن گئے ہیں اور اس کا کیا سبب ہے کہ۔
 رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
 برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!
 اس لئے کہ ایک عام سادہ لوح مسلمان کی سوچ تو لامحالہ یہ ہے کہ ہم خواہ افعال و اعمال اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے کتنی ہی پستی میں گر چکے ہوں، بہر حال کلمہ گو اور خاتم النبیین اور سید المرسلین ﷺ کے امتی ہیں اور ”توحید کی امانت“ کے حامل اور صراطِ ”ہر کہ عشقِ مصطفیٰ“ سامانِ اوست!“ کے کسی نہ کسی درجے میں مدعی ہیں۔
 جبکہ یہود و نصاریٰ اور بقیہ جملہ اقوامِ عالم کھلم کھلا کافرو مشرک اور اللہ اور رسول کی

صاف منکر و مخالف ہیں اور قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ ”اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا“۔

ان سوالات پر قرآن وحدیث کی روشنی میں سنجیدگی سے غور ان اسباب کی بناء پر لازمی ہے کہ :

(۱) جیسے قرآن مجید میں بار بار نبی اکرم ﷺ سے کہلوا یا گیا کہ ”لوگو! جس بات کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے یا جس عذاب کی وعید سنائی جا رہی ہے میں نہیں جانتا کہ وہ قریب ہے یا ابھی کچھ دور ہے“ (جیسے مثلاً سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۹ میں اور سورۃ الجن کی آیت ۲۵ میں) اسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ عذاب استیصال کے ذریعے یہود کے خاتمے اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کا ”انقلاب عظیم“ قریب آچکا ہے یا ابھی کچھ دیر تک موجودہ صورت ہی برقرار رہے گی۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چونکہ احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ”ع“ اور کچھ روز فضاؤں سے لبوہرے گا“ کے مصداق ابھی موجودہ صورت حال مزید گھمبیر ہوگی اور امت مسلمہ پر عذاب الہی کے مزید اور شدید تر کوڑے برسیں گے، لہذا ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال کے اسباب اور قرآن کے فلسفہ عذاب کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ ”وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِيمَا كُنْتُمْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ“ یعنی ”اور جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث ہوتی ہے“ اور اللہ بہت سی کوتاہیوں سے تودرگزر بھی کرتا رہتا ہے!“ کے مطابق یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ یہ حالات کیفیات ع اے باد صبا میں ہمہ آوردہ تست!“ کے مصداق ہماری اپنی بے عملی ہی نہیں بد اعمالی کا نتیجہ ہیں تاکہ نہ ہم ”ظَالِمِينَ بِاللَّهِ ظُلْمَ الشَّوْءِ“ (الفتح : ۶) یعنی اللہ سے بد ظنی کرنے والوں کے زمرے میں شامل ہوں نہ ہمارے دلوں میں اللہ سے کوئی شکوہ شکایت پیدا ہو، بلکہ اپنی خطاؤں کے اعتراف کے ساتھ حقیقی پشیمانی اور خشوع و خضوع اور تضرع و اجابت کی کیفیات پیدا ہوں جو توبہ کی لازمی شرائط ہیں!

(۲) جیسے ہر جسمانی عارضے کے صحیح علاج کے لئے مرض کی صحیح تشخیص لازمی ہے اسی طرح ضروری ہے کہ اُمت کی موجودہ زبوں حالی کے اصل اسباب کا صحیح تعین کیا جائے تاکہ ہماری قوتیں اور توانائیاں اور وقت کی قیمتی متاع سطحی قسم کی تدابیر میں ضائع نہ ہو جائیں، بلکہ ہم صورت حال کی سنگینی کے صحیح ادراک اور اُمت کے مزمن اور پیچیدہ امراض کے گہرے اسباب و عوامل کا صحیح شعور حاصل کر کے ان کے مداوا اور معالجہ کے لئے صحیح اور مؤثر تدابیر اختیار کر سکیں اور اس تلخ حقیقت کے اعتراف کے ساتھ کہ اس وقت ہم بحیثیت اُمت عذاب الہی کی گرفت میں ہیں اس سے رستگاری کے حصول اور اللہ کے عفو و مغفرت کے دامن میں آنے کے لئے صحیح طریق کار پر عمل پیرا ہو سکیں — لہذا ان شاء اللہ العزیز آئندہ سطور میں ”قرآن کے فلسفہ عذاب“ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء

قرآن کا قانون عذاب

ہمارا ایمان ہے کہ اس کائنات میں ایک پتہ بھی اللہ کے اذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی پورے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے ان اہل قوانین اور قواعد و ضوابط یعنی قرآن حکیم کی اصطلاح میں اللہ کی اس "سنت" کے تحت ہوتا ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۲ میں کہ:

وَلَنْ نَّجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝

"تم ہرگز نہ پاؤ گے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی!"

بعینہ یہی مضمون سورۃ فاطر کی آیت ۴۳ اور سورۃ الفتح کی آیت ۲۳ میں بھی وارد ہوا ہے۔۔۔۔۔ لہذا اگر آج پوری دنیا میں مسلمان شدید مصائب اور آلام سے دوچار ہیں تو یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کے کسی قانون یعنی اس کی اہل اور مستقل سنت کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اگر ہم دل سے چاہتے ہیں کہ یہ صورت حال تبدیل ہو تو لازم ہے کہ قرآن حکیم پر تدبیر اور تفکر کے ذریعے اللہ کے قانون عذاب کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس لئے کہ اسی پر اصلاح احوال کی صحیح اور موثر تدابیر کے فہم و شعور کا انحصار اور دار و مدار ہے۔

قرآن حکیم کے عام اسلوب کے مطابق اس کا "قانون عذاب" بھی کہیں پورے کا پورا یکجا بیان نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کی مختلف دفعات متفرق طور پر مختلف مقامات پر وارد ہوئی ہیں۔ اور اگر ان سب کو جمع اور مرتب کر کے ان کی پشت پر کار فرما حکمت سمیت بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ:

(۱) یہ دنیا بنیادی طور پر دارالغذاب نہیں دارالامتحان ہے، اور جزا و سزا کا معاملہ اصلاً دنیا سے نہیں آخرت سے متعلق ہے۔ چنانچہ اس حیات انسانی میں سے جو علامہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ۔

”تو اسے پیانہ امروز و فردا سے نہ تپ

جاو دوں، پیہم دوں، ہر دم جواں ہے زندگی“

اتنی طویل ہے کہ دنوں، مہینوں اور سالوں کی صدیوں میں بھی نہیں ٹاپی جاسکتی، موت کا ایک وقفہ ڈال کر (۔) ”موت ایک زندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر“ جو نہایت مختصر اور حقیر سا حصہ ”حیات دنیوی“ کی صورت میں علیحدہ کر لیا گیا ہے، اس کی اصل غرض و غایت آزمائش اور امتحان و ابتلاء ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۃ الملک کی آیت ۲ میں کہ:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

”اس نے مائے موت اور زندگی تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا“

جس کی بہترین ترجمانی کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ۔

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب

اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی کا

اس امتحان میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ قیامت کے دن ہو گا، جہاں اگرچہ اس غرض کے لئے تو قوموں اور امتوں کی اجتماعی پیشی بھی ہو گی کہ ان کی جانب مبعوث کئے جانے والے رسول استغاثے کے گواہوں کی حیثیت سے ان پر حجت قائم کر سکیں کہ ہم نے تو تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا تھا، اب اپنے طرز عمل کے لئے تم خود جوابدہ ہو، تاہم اصل محاسبہ ہر انسان کا خالص انفرادی حیثیت پر ہو گا جیسے کہ فرمایا سورۃ مریم کی آیت ۹۵ میں کہ:

وَكُلُّهُمْ اِتٰی بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَرْدًا ۝۱

”ان میں سے ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور میں پیش ہو گا فرداً فرداً یعنی

اکیلا اکیلا!!

گویا انفرادی سطح پر کسی انسان پر جو مصیبتیں حیاتِ دنیوی کے دوران نازل ہوتی ہیں وہ امتحان اور آزمائش کی غرض سے ہوتی ہیں، عذاب یا سزا کے طور نہیں۔ اس قاعدہ کلیہ میں صرف ایک استثناء جو بعض احادیث نبویہ (ﷺ) سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک اور مقبول بندے کو دنیا میں کسی تکلیف میں اس لئے مبتلا کر دیتا ہے کہ اسے اس کی کسی خطا کا کفارہ بنادے، تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائے۔ تاہم منطق کے عام قاعدے کے مطابق اس استثناء سے قاعدہ کلیہ ختم نہیں ہوتا۔ (۲) البتہ اس قاعدہ کلیہ کا کامل اطلاق صرف افراد پر انفرادی حیثیت سے ہوتا ہے۔ قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی اجتماعی غلط روی اور مجموعی بد اعمالی کی سزا اکثر و بیشتر اس دنیا میں دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ بالکل صحیح فرمایا ہے علامہ اقبال نے کہ۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

اور قوموں اور امتوں پر وارد ہونے والے اس اجتماعی عذاب کا تلخ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں گیبوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ یعنی گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ بے گناہ بھی عذاب کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ میں کہ:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَلَا عَامًّا إِنَّ
اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

”اور ڈرو اس فتنہ سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہیں ہو گا اور
جان رکھو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے!“

اگرچہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ایک استثناء کی امید دلائی ہے یعنی یہ کہ کسی قوم یا امت پر وارد ہونے والے اجتماعی عذاب سے ان لوگوں کے بچنے کی امید کی جاسکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ خود بدی سے اجتناب کرتے رہیں بلکہ اپنی قوم کو غلط روش اور اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں

جیسے کہ سورۃ الاعراف میں اصحاب السبت پر نازل ہونے والے عذاب کے ضمن میں فرمایا:

أَنجَبْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْرِ (آیت ۱۶۵)

”اور ہم نے بچالیا ان لوگوں کو جو بدی سے روکتے رہے تھے۔“

(۳) قوموں اور امتوں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب کی بدترین اور شدید ترین صورت وہ ہے جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جن کی جانب اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے ان پر اپنی دعوت و تبلیغ میں سعی لیغ فرما کر اور حق کی قوی و عملی شہادت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ رکھ کر اتمام حجت کا حق ادا کر دیا۔ اس کے باوجود ان کی قوموں نے بحیثیت مجموعی ان کی دعوت کو رد کر دیا اور حق کی راہ اختیار نہ کی تو ان پر ”عذاب استیصال“ نازل ہوا۔ یعنی صرف رسولوں اور ان محدودے چند لوگوں کو بچا کر جو ان پر ایمان لائے، باقی پوری پوری قوموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی یعنی انہیں نیست و نابود اور نیا مشیئہ کر دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کا ہر قاری بخوبی واقف ہے کہ اسی عذاب استیصال یا عذاب اکبر کی مثالیں ہیں وہ عذاب جو قوم نوح، قوم صالح، قوم لوط، قوم شعیب اور آل فرعون پر نازل ہوئے جن کے نتیجے میں کہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ ”كَانَ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا“ یعنی ”وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں!“ (سورۃ ہود: ۶۸ اور ۹۵) کہیں فرمایا گیا کہ ”لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ“ یعنی اب ”ان کے مکانوں اور مسکنوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا“ (سورۃ الاحقاف: ۲۵) یعنی ان کے مکین نیست و نابود ہو گئے! اور کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ: ”فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا“ یعنی ”ان ظالموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی“ (سورۃ الانعام: ۴۵)

واضح رہے کہ اس نوع کے عذاب کے ضمن میں قرآن نے ایک سے زائد مرتبہ وضاحت اور صراحت کی ہے کہ یہ کسی رسول کی بعثت کے ذریعے اتمام حجت کے بعد ہی نازل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں اسی نوع کے عذاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا (آیت ۱۵)

”اور ہم عذاب بھیجے والے نہیں ہیں جب تک کسی رسول کو مبعوث نہ کر دیں“

اور سورۃ القصص کی آیت ۵۹ میں بھی یہی قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے کہ:
وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَى حَتَّى يَبْعَثَ فِي أُمْنَاهَا رُسُلًا يَتْلُوا
عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا

”آپ کے رب کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے جب تک ان
کے مرکزی مقام پر ایک رسول نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات سنا دے!“

اس عذاب استیصال یا عذاب اکبر کے ضمن میں اللہ کی یہ سنت بھی قرآن میں بار بار بیان
ہوئی ہے کہ جس قوم کی جانب اللہ تعالیٰ رسول کو مبعوث فرماتا تھا اس پر آخری اور بڑے
عذاب سے قبل چھوٹے چھوٹے عذاب لوگوں کو جھنجھوڑنے کی غرض سے نازل فرماتا تھا
تاکہ جو جاگ سکتے ہوں جاگ جائیں اور جن میں اصلاح پذیری کا مادہ موجود ہو وہ اپنی
اصلاح کر لیں۔ چنانچہ اسی سکتِ الہی کا ذکر ہے اختصار کے ساتھ سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱
میں:

وَلَنَذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَى دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُونَ ۝

”اور ہم انہیں لازماً مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے قبل“
شاید کہ یہ رجوع کر لیں!“

اور اسی کا تفصیلاً ذکر ہے سورۃ الانعام کی آیات ۴۱ تا ۴۵ اور سورۃ الاحزاب کی آیات ۹۳ تا
۹۶ میں:

(۴) قوموں اور امتوں پر بحیثیت اجتماعی اس دنیا ہی میں نازل ہونے والے عذابِ الہی کی
دوسری قسم وہ ہے جو رسولوں کی امتوں پر ان کی غلط روی اور بد اعمالی کے باعث نازل ہوتا
ہے۔ یہ عذاب مقدم الذکر عذاب استیصال سے اس اعتبار سے تو ہلکا ہوتا ہے کہ اس کے
ذریعے قوموں یا امتوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس اعتبار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا
ہے کہ یہ وقفہ وقفہ سے مسلسل آتا رہتا ہے۔ اور جب کوئی مسلمان امت اس نوع کے
عذاب میں مبتلا ہوتی ہے تو اس پر جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے اسے منفی طور پر بیان کیا
جائے تو وہ اس جنمی انسان کی سی ہوتی ہے جو قرآن کے الفاظ میں ”ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا“

وَلَا يَخْيِي "کا مصداق ہو جاتا ہے یعنی "نہ وہ زندہ ہی رہتا ہے نہ اسے موت آتی ہے۔" اور اگر اسے مثبت طور پر بیان کیا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ "عمر" زندگی نام ہے مرم کے بننے جانے کا۔"

اس قسم کے عذاب کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ جو قوم کسی رسول اور خاص طور پر کسی صاحب کتاب و شریعت رسول کی امت ہونے کی مدعی ہوتی ہے وہ گویا زمین پر اللہ کی نمائندہ ہونے کی دعویٰ دار ہوتی ہے۔ اب اگر اس کا طرز عمل اور رویہ اس کے دعوے کے برعکس ہو، اور وہ اپنے انفرادی اخلاق و اعمال اور سیرت و کردار اور اپنی اجتماعی تہذیب و ثقافت اور معاشی و سیاسی نظام میں کتاب الہی کی تعلیمات اور شریعت خداوندی کے احکام سے مختلف ہی نہیں متضاد نقشہ پیش کرے تو یہ جرم ناقابل معافی ہے، اس لئے کہ اپنے اس طرز عمل کے باعث یہ نام نہاد مسلمان امت بجائے اس کے کہ خلق اور خالق کے مابین واسطہ (امت وسط) اور رابطہ کا ذریعہ بنے، الٹی حجاب اور رکاوٹ بن جاتی ہے اور اس کو دیکھ کر اللہ کے بندے اللہ کے دین کی جانب راغب ہونے کی بجائے الٹے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصف کی آیات ۲۴ میں فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ

"اے ایمان کے دعویدارو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ تمہارا یہ طرز عمل کہ جو زبان سے دعویٰ کرو اس پر عمل میں پورے نہ اترو اللہ کے غضب کو بہت بھڑکانے والا ہے!"

اس نوع کے اجتماعی عذاب میں مبتلا ہونے والی اقوام یا امتوں کا ایک وصف مشترک جسے قسمت کی ستم ظریفی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یہ ہے کہ وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم تو اللہ کے بہت چیمتے اور لاڈلے ہیں، اور ہمارا معاملہ دوسرے عام لوگوں کا سا نہیں ہے بلکہ ہم اللہ کے یہاں خصوصی اور ترجیحی سلوک کے مستحق ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس جمل مرکب میں مبتلا قوم پر جیسے جیسے عذاب الہی کے کوڑوں کی شدت بڑھتی جاتی ہے اس کے متذکرہ بالا زعم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا صورت یہ بن جاتی

ہے کہ اودھر درے پر درہ پڑتا جاتا ہے، اور اودھر غرہ پر غرہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی کلاسیکل مثال ہے سابقہ امت مسلمہ یعنی یہود اور نصاریٰ کا یہ قول جو سورۃ المائدہ کی آیت ۱۸ میں نقل ہوا ہے کہ:

نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَآِحِبَاءُهُ

”ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں، اور اس کے نہایت چہیتے اور لاڈلے!“

جس پر اللہ تعالیٰ نے نہایت عبرت انگیز تبصرہ فرمایا:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ

”اے نبی (ﷺ) ان سے کہئے کہ پھر اللہ تم پر تمہارے گناہوں کی پاداش میں

عذاب کیوں نازل فرماتا رہا ہے؟ تمہارے اس زعم کے برعکس تم بھی ویسے ہی

انسان ہو جیسے دوسرے جو اللہ نے پیدا فرمائے!“

اسی طرح ان کا ایک مزعومہ عقیدہ یہ بھی تھا کہ:

لَنْ نَمْسَسَ النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً

”ہمیں تو (جہنم کی) آگ چھو ہی نہیں سکتی سوائے کتنی کے چند دنوں کے!“

جس پر نہایت فصیح و بلیغ تبصرہ وارد ہوا:

قُلْ أَتَّخِذُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ تُخْلَفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ

عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (البقرہ آیت ۸۰)

”اے نبی (ﷺ) ان سے پوچھئے کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے

جس کے بارے میں تمہیں وثوق ہے کہ اللہ ہرگز اپنے اس عہد کی خلاف ورزی

نہیں کرے گا؟ یا تم بغیر کسی علم کے اللہ کی جانب غلط باتیں منسوب کر رہے ہو؟“

اس نوع کے اجتماعی عذاب کے بارے میں یہ قاعدہ کلیہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ صر

”جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!“ کے مطابق کسی امت کو جس قدر بلند

درجہ فضیلت حاصل ہوتا ہے اس کے غلط طرز عمل پر عذاب کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ

ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی بھی نہایت نمایاں مثال قرآن حکیم میں سابقہ امت مسلمہ یعنی

یہودی کے ضمن میں وارد ہوئی ہے۔ یعنی ان پر عذاب الہی کی شدت کے بیان کے لئے جو

الفاظ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۱ میں وارد ہوئے ہیں کہ:

صُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوهُمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ
 "ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!"

ان سے کچھ ہی قبل یہ آیت مبارکہ بھی وارد ہوئی ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِي اَنْعَمْتُ عَلٰیكُمْ وَاَنْتٰى
 فَنَصَّلْتُكُمْ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (البقرہ: ۴۷)

"اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے ان انعامات و احسانات کو جو میں نے تم پر

کئے۔ اور میں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمادی تھی!"

پھر یہی معاملہ کسی مسلمان امت کے مختلف طبقات کا ہے کہ ان میں سے جسے جتنی زیادہ
 فضیلت حاصل ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ اس کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے، اور غیر ذمہ دارانہ
 طرز عمل کے نتیجے میں اتنی ہی سخت سزا بھی اسے ملتی ہے!

(۵) مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ از خود برآمد ہو جاتا ہے کہ جو قوم نہ کسی رسول کی
 امت ہونے کی مدعی ہو نہ ہی اس کی جانب اس کی یادداشت اور معلوم و محفوظ تاریخ کی
 حد تک کوئی رسول مبعوث ہوا ہو اس کے عذاب و ثواب اور جزا و سزا کا سارا معاملہ
 آخرت سے متعلق ہے۔ حیات دنیوی کی حد تک وہ حیوانات اور چرند و پرند کے مانند اور
 سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۰ "كُلًّا نُّنَمِّدُهُمْ هُوًا لَّآءٍ وَهُوَ لَّآءٍ مِنْ عَطَاؤِ رَبِّكَ" اور سورۃ
 الاحقاف کی آیت ۲۰ "اَذْهَبْنٰمْ طَيِّبًا نَّكْمُ فِیْ حَیٰاتِكُمْ الدُّنْیَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا"
 کے مطابق اللہ کی عطا اور جود و سخا کے دسترخوان سے کھاتی سکتے ہیں، اور دنیا کی نعمتوں اور
 لذتوں سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی حد تک تو ان پر صرف پسنگر کے فلسفہ تاریخ
 کے مطابق اس قانون طبعی ہی کا اطلاق ہو گا کہ جیسے ہر فرد پیدا ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے،
 پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے ایسے ہی قومیں اور تہذیبیں بھی مختلف طبعی ادوار
 سے گذر کر بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ رہا حیات اخروی اور یوم قیامت کے محاسبہ کا معاملہ تو
 وہ تو ہر فرد نوع بشر کا اپنے اپنے نظریات و عقائد اور اخلاق و اعمال کے اعتبار سے طے ہونا
 ہی ہے!

سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں اور سابقہ امت کی دو ہزار سالہ تاریخ کے چار ادوار

قرآن حکیم میں ناموں کی صراحت کے ساتھ تو صرف پچیس انبیاء اور رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے، البتہ بعض نبیوں کا تذکرہ بغیر نام لئے بھی وارد ہوا ہے۔ مزید برآں یہ اصولی بات بھی دو مقالات پر بیان ہوئی ہے کہ ایسے بھی بہت سے رسول دنیا میں گذرے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا (جیسے مثلاً سورۃ النساء کی آیت ۶۴ اور سورۃ غافر کی آیت ۷۸ میں)۔ پھر یہ اصول بھی دو ہی مرتبہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ”لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ“ یعنی ”ہر قوم کے لئے ہادی بھیجے گئے“ (سورۃ الرعد آیت ۷) اور ”إِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ“ یعنی ”کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ آیا ہو“ (سورۃ فاطر آیت ۲۴)۔ چنانچہ بعض روایات کے مطابق انبیاء کی تعداد اتنی ہی رہی ہے جتنے مسلمان جنتہ الوداع کے موقع پر آنحضور ﷺ کے ساتھ تھے یعنی ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ، اور رسولوں کی کل تعداد اتنی تھی جتنی تعداد میں جان نثار صحابہؓ غزوہ بدر میں آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے، یعنی تین سو تیرہ۔ واللہ اعلم!

اس سے قطع نظر کہ دنیا میں جو رسول مبعوث ہوئے ان کی کل تعداد کتنی ہے اس امر پر تقریباً اجماع ہے کہ ان میں سے پانچ سورۃ الاحقاف کی آیت ۳۵ میں وارد شدہ اصطلاح کے مطابق ”اولو العزم“ ہیں۔ یعنی حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ چنانچہ ان ہی کا تذکرہ سورۃ الشوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ میں وارد ہوا ہے۔ پھر ان میں سے بھی صرف

دو ہیں جنہیں کتاب اور شریعت سے نوازا گیا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ضمن میں تو کسی صحیفے کا ذکر تک کہیں موجود نہیں ہے، ”صحیفہ ابراہیم“ کا ذکر اگرچہ قرآن میں ہے (سورۃ النجم آیت ۳ اور سورۃ الاعلیٰ آیت ۱۹) لیکن غالباً انہیں ”کتاب“ اس لئے نہیں قرار دیا گیا کہ ان میں کوئی شریعت درج نہیں تھی۔ (راقم کو بعض لوگوں کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ ہندوؤں کے ویدوں اور اپنشدوں میں سے بعض صحیفہ ابراہیم کی بگڑی ہوئی اور تحریف شدہ صورتیں ہیں، تاہم ان میں بھی اگرچہ توحید کا بیان تو بلند ترین سطح پر بھی موجود ہے، لیکن احکام اور شریعت کا کوئی وجود نہیں ہے!) اسی طرح زبور اور انجیل کو بھی اگرچہ عرف عام میں کتابیں کہہ دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مستقل بالذات کتابیں نہیں تھیں بلکہ تورات ہی کے ضمیموں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ چنانچہ زبور صرف حمد اور مناجات باری تعالیٰ کے ترانوں پر مشتمل ہے، اور انجیل صرف حکمت اور موعظت پر ایسی وجہ ہے کہ سورۃ الزخرف کی آیت ۶۳ میں آنجناب کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ”قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ“ یعنی ”میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں“ گویا وہ آسمانی کتابیں جن کے ذریعے نوع انسانی کو شریعت خداوندی عطا ہوئی دو ہی ہیں یعنی اولاً تورات جو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت قرار دی گئی (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۲ اور سورۃ السجدہ آیت ۲۳) اور ثانیاً قرآن حکیم جو پوری نوع انسانی کے لئے ہدایت ہی نہیں ”الہدیٰ“ قرار پایا۔

چنانچہ صاحب کتاب و شریعت مسلمان آئیں بھی پوری تاریخ انسانی کے دوران دو ہی ہوئی ہیں یعنی: ایک سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری موجودہ امت مسلمہ یعنی امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اور چونکہ اس وقت دنیا کے حالات تیزی کے ساتھ جو رخ اختیار کر رہے ہیں اور مستقبل میں جو حوادث و واقعات پیش آنے والے ہیں ان کے ضمن میں ان دونوں امتوں کی باہمی آویزش اور ان کے آخری انجام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس قانون عذاب کو فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل ہے جس پر

اس سے قبل مفصل گفتگو ہو چکی ہے، لہذا ان دونوں کے بعض مشترک اور بعض ماہم الامتياز خصائص کے علاوہ ان کے ماضی اور حال کا مختصر جائزہ ضروری ہے تاکہ مستقبل کے بارے میں جو اشارات قرآن حکیم میں وارد ہوئے ہیں اور جو تفصیلی پیشینگوئیاں احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بیان ہوئی ہیں ان کو صحیح پس منظر میں سمجھا جاسکے۔ اور اس طرح ایک جانب حدیث نبوی اور جناب صادق و مصدق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیوں کی عظمت اور حقانیت پر دل مطمئن ہو جائیں اور دوسری جانب پیش آنے والے حوادث و واقعات پر ذہن کا ردِ عمل تیز اور استجاب کا نہ ہو بلکہ وہ ہو جو سرمد کے اس مصرعے میں بیان ہوا کہ: ”یایا من تراخوب می شاسم!“ یعنی آؤ کہ میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں!

بنی اسرائیل کی تاریخ کا آغاز اگرچہ ویسے تو لگ بھگ ۱۸۰۰ قبل مسیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے ہوتا ہے، اس لئے کہ انہی کا لقب ”اسرائیل“ یعنی ”اللہ کا بندہ“ تھا اور بنی اسرائیل ان ہی کی اولاد ہیں، لیکن ان کو امت مسلمہ کی حیثیت تقریباً ۱۳۵۰ ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حاصل ہوئی جب انہیں تورات عطا ہوئی اور ان سے کتاب الہی کو مضبوطی سے تھامنے اور شریعتِ خداوندی پر کاربند رہنے کا وہ پختہ عہد و میثاق لیا گیا جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار بہت شد و د سے آتا ہے۔ بہر حال اُس وقت سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک جب خاتم النبیین اور سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، گویا لگ بھگ دو ہزار برس تک، بنی اسرائیل ہی کو اس دنیا میں کتاب الہی کی امین اور شریعتِ خداوندی کی حامل امت مسلمہ کی حیثیت حاصل رہی۔ تا آنکہ ۶۳۳ء میں تحویل قبلہ کو بنی اسرائیل کی معزولی اور نئی امت یعنی امت محمدیہ ﷺ کے اس منصب پر فائز کئے جانے کی علامت بنا دیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے تا قیام قیامت امت محمدیہ ﷺ ہی کتاب و شریعت کی حامل و امین اور روئے ارضی پر اللہ کی نمائندگی کی ذمہ دار ہے!

کتاب الہی کے امین اور شریعتِ خداوندی کے حامل ہونا بجائے خود۔

”یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!“

کے مصداق ایک بہت بڑا درجہ فضیلت ہے جو ان دونوں امتوں کے مابین قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دوبار یہ آیت مبارکہ سابقہ امتِ مسلمہ کے ضمن میں وارد ہوئی:

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اِذْ كُنُوْا رٰٓغِبِيْنَ اِلَيْهِ اَنْعَمْتُ عَلٰيْكُمْ وَاٰتٰىكُمْ فَضْلًا كَثِيْرًا ۝۱۰

”اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا۔ اور میں نے تو تمہیں تمام جہانوں (یعنی تمام جہان والوں) پر فضیلت دیدی تھی!“ (سورۃ البقرہ آیات ۱۲۷ اور ۱۲۸)۔

لیکن امتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ایک مزید درجہ فضیلت اس بنا پر حاصل ہے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت اپنے نقطہ عروج اور درجہ کمال کو پہنچ کر ختم ہو گئیں اور آپ ﷺ کی بعثت تمام سابق انبیاء و رسل کے مانند صرف اپنی اپنی قوموں کی جانب نہیں، بلکہ پوری نوعِ انسانی کی جانب ہوئی، جیسے کہ فرمایا سورۃ سہا کی آیت ۲۸ میں کہ: ”وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّاٰذِيْرًا“ یعنی ”ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر!“ لہذا آپ ﷺ کی امت گویا اجتماعی طور پر تاقیام قیامت فریضہ رسالت کی امین بھی ہے۔ یعنی اس کی ذمہ داری سابقہ امتِ مسلمہ کی طرح صرف یہی نہیں ہے کہ خود کتابِ الہی کو مضبوطی سے تھامے رہے اور شریعتِ خداوندی پر سختی سے کاربند رہے بلکہ یہ بھی ہے کہ پوری نوعِ انسانی تک رسالتِ محمدی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کرے اور پورے کرہ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے یعنی عالمی سطح پر حکومتِ الہیہ یا خلافتِ علی منہاج التبوۃ کے نظام کے قیام کے لئے سر دھڑکی بازی لگا دے۔ اس لئے کہ یہی از روئے قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت ہے۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں تین

بار فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى
الدِّينِ كُلِّمَةٍ

”وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن
حکیم) اور دین حق (اسلام) دے کر تاکہ غالب کریں اسے (دین حق
کو) پورے کے پورے دین (نظام زندگی) پر“

(سورۃ التوبہ آیت ۳۳، سورۃ الفتح آیت ۲۸ اور سورۃ الصف آیت ۹)

یہی وجہ ہے کہ امت محمد ﷺ کو ”امت وسط“ بھی قرار دیا گیا جس کا فرض پوری نوع
انسانی پر اللہ اور رسول ﷺ کی جانب سے شہادت یعنی اتمام حجت کا فریضہ ادا کرنا ہے
اور ”خیر امت“ یعنی بہترین امت کا خطاب بھی دیا گیا ”جو پوری نوع انسانی کے لئے برپا کی
گئی ہے“۔ بقول علامہ اقبال۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کیس ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!

درجہ فضیلت کے اس فرق و امتیاز کے ساتھ ساتھ سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں
کے مابین ایک اور فرق و تفاوت یہ ہے کہ جہاں سابقہ امت مسلمہ ایک ”یک نسل امت“
تھی وہاں چونکہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوع انسانی کی جانب ہے لہذا موجودہ

لَوْ كَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ: ۱۴۳)
”اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت (بہترین امت) بنایا، تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں
پر“ اور رسول گواہ ہو جائیں تم پر۔“

لَقَدْ كُنْتُمْ فِئْتًا خَعِيرًا أُمِّيَّةً أَتُخْبِرُ بَعْثَ النَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران: ۱۱۰)
”تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لئے برپا کیا گیا ہے، تم نیک کا حکم دیتے ہو، بدی سے
روکتے ہو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہو!“۔

امت مسلمہ ہمہ نسلی اور ہمہ قومی (Multinational) امت ہے۔ مزید برآں درجہ فضیلت کے اعتبار سے خود یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے جن کا صراحت کے ساتھ ذکر سورۃ الجمعہ میں کر دیا گیا ہے، یعنی ایک ”اقمیین“ یعنی بنی اسماعیل ”اور ان کے تابع اہل عرب“ اور دوسرے ”آخرین“ یعنی ان کے سوا تمام نسلوں اور جملہ اقوام عالم میں سے ایمان لانے والے مسلمان! اور ان میں سے مقدم الذکر کو ان دو اسباب کی بنا پر بہت بڑا درجہ فضیلت حاصل ہے کہ (۱) خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی میں سے تھے۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ

”وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا امیوں میں ایک رسول (محمد ﷺ) ان ہی میں سے!“

چنانچہ یہ تو ”یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!“ کے مصداق وہ فضیلت ہے جس پر اہل عرب جتنا ناز کریں کم ہے! اور (۲) یہ کہ اللہ نے ان ہی کی زبان میں اپنا آخری کلام اور نوع انسانی کے نام اپنا آخری پیغام نازل فرمایا، جس کا فہم ان کے لئے نہایت آسان ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

نوع انساں را پیامِ آخرین
حائل او رحمتِ لعلِ لعلیں!

یہ پوری بحث اس اعتبار سے تو یقیناً بڑی خوش آئند بھی ہے اور دل پسند بھی کہ ہمیں بحیثیت امت محمد ﷺ سابقہ امت مسلمہ پر بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس کا ایک منطقی نتیجہ نہایت تلخ ہے۔ یعنی اولاً ”جن کے رتبے ہیں سوا“ ان کی سوا مشکل ہے!“ کے عام اور معقول اصول کے مطابق اور ثانیاً خود قرآن حکیم کی اس نص کی رو سے جو سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات سے خطاب کے ضمن میں وارد ہوئی ہے یعنی: ”يُنِيسَاءَ النَّبِيِّ كُنُسُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ“ یعنی ”اے نبی کی گھر والو! تم عام عورتوں کے مانند نہیں ہو“ (آیت ۳۲) اور ”مَنْ يَأْتِ مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ“ یعنی ”اگر تم میں سے کسی

نے کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کیا تو اسے (دوسروں کے مقابلے میں) دگنا عذاب دیا جائے گا" (آیت ۳۰) یہ ناقابل تردید نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی جرم کی جو سزا بنی اسرائیل کو دی گئی اسی جرم کا ارتکاب موجودہ امت مسلمہ کرے گی تو اس کے مقابلے میں دوہرے ترے ہی نہیں بیسیوں گنا عذاب کی مستحق ہوگی۔ اور خود امت مسلمہ میں سے سورۃ النور میں وارد شدہ الفاظ "وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ" یعنی "اور وہ جو والی ہوا اس کے سب سے بڑے حصے کا" (آیت ۱۱) کے مطابق اس عذاب کی شدید ترین صورت کے مستحق مسلمانان عالم عرب ہوں گے!

مندرجہ بالا اصولی نتائج کو ذہن میں جاگزیں کرنے کے بعد اب آئیے کہ پہلے ہم سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی تاریخ کے بعثت نبوی (ﷺ) تک کے دور پر ایک نظر ڈال لیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دو ہزار سالہ دور کا وہ خلاصہ جو نئی امت مسلمہ یعنی امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی سبق آموزی اور عبرت پذیری کے لئے کافی تھا کمال فصاحت اور غایت اختصار کے ساتھ قرآن حکیم میں سورۃ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی چھ (۲ تا ۷) اور آخری رکوع کی چار (۱۰۱ تا ۱۰۴) یعنی کل دس آیات میں بیان کر دیا گیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے نزول کے زمانے تک بنی اسرائیل پر چار دور گزر چکے تھے: دو دور عروج کے جن کے دوران ان کا طرز عمل بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے درست رہا اور انہیں دنیا میں عزت و سربلندی بھی حاصل رہی اور وہ کثرتِ اموال و اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے۔۔۔ اور دو ہی دور زوال کے جن کے دوران انہوں نے نفس پرستی اور بغاوت کی روش اختیار کی، جس کے نتیجے میں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور غیر اقوام کے ہاتھوں وہ خود بھی ذلیل و خوار اور مفتوح و مغلوب ہوئے اور ان کے دینی و روحانی مرکز یعنی بیت المقدس کی حرمت بھی پامال ہوئی۔۔۔۔ تاہم اگر اس کی کسی قدر وضاحت تاریخی اور زمانی ترتیب کے ساتھ کی جائے تو وہ حسب ذیل ہے:

۱۔ ان کے پہلے دورِ عروج کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اول حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے ہوا اور تقریباً تین سو سال تک نشیب و فراز کے مراحل طے کرتا ہوا یہ دورِ سعادت حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہدِ حکومت میں اپنے نقطہ عروج کو پہنچا جو تاریخ بنی اسرائیل کے عہدِ زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے ساتھ ہی ان کے پہلے دورِ زوال کا آغاز ہو گیا، اس لئے کہ فوراً ہی ان کی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ہر حال تقریباً تین سو سال ہی میں یہ عہدِ زوال بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ چنانچہ اولاً شمال سے آشوریوں نے شمالی سلطنت اسرائیل کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر ۵۸۷ قبل مسیح میں مشرق (عراق) سے آنے والے نبوخذ نصر (بخت نصر) کے حملے نے نہ صرف یہ کہ پوری جنوبی سلطنتِ یہودیہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ یروشلیم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، لاکھوں افراد کو قتل کیا، چھ لاکھ یہودی مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کی طرح ہانکتا ہوا ہابیل لے گیا۔۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیکلِ سلیمانی کو کلیۃً مسمار کر دیا حتیٰ کہ اس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں!۔۔۔۔۔ بابل کی لگ بھگ سو سالہ اسیری کا دور بنی اسرائیل کی ذلت و رسوائی کا شدید ترین زمانہ ہے!

۳۔ بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج کا آغاز بابل کی اسیری سے شہنشاہِ فارس ساؤس یا کبھورس یا ذوالقرنین کے ہاتھوں نجات کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل حضرت عزیر علیہ السلام کی تجدیدی و اصلاحی مساعی سے ہوا اور دوسری خوشحالی یا سرپابندی کا یہ دور بھی لگ بھگ تین سو سال جاری رہا اور اس کا مظہرِ اعظم وہ مکابی سلطنت تھی جو تقریباً ۱۷۵ ق م سے ۶۳ ق م تک نہایت دہذبہ اور شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی اور جس نے ایک بار پھر حضرت داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کے دور کی یاد تازہ کر دی۔

۴۔ بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال ۶۳ ق م میں رومی فاتح پومپی کے ہاتھوں یروشلیم

کی فتح سے شروع ہوا اور تاحال جاری ہے۔ اس کے دوران ان کی تاریخ میں دوسری بار ان پر عذابِ الہی کے سخت کوڑے برسے، چنانچہ ۷۰ء میں رومی جرنیل ٹائٹس نے دوبارہ یروشلم شہر اور پیکل سلیمانی کو مسمار کیا اور ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودیوں کو تہ تیغ کر ڈالا اور ۶۷ ہزار کو غلام بنالیا۔ اور اس دن سے جو یہودی اثر و رسوخ سرزمینِ فلسطین سے ختم ہوا تو لگ بھگ انیس سو برس تک انہیں وہاں سر اٹھانے کا موقع نہ ملا، بلکہ پورے چھ سو برس تو اس سرزمین میں ان کا داخلہ بھی بند رہا۔ رہا ان کا پیکل مقدس تو وہ آج تک دوبارہ تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں رومی شہنشاہ ہیڈریان نے یروشلم شہر کو دوبارہ تعمیر کیا تو اس کا نام بھی یروشلم نہیں ”ایلیا“ رکھا۔

۲۶ اپریل ۱۹۹۳ء

موجودہ امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے چار ادوار

امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہؓ ابن عمروؓ ابن العاص سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

لَيَأْتِيَنَّ عَلَى أُمَّتِي مَا أَتَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَدُّو النَّعْلَ
بِالنَّعْلِ

”میری امت پر بھی لازماً وہ تمام حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر واقع ہوئے بالکل ایسے ہو، جیسے (ایک جوڑے کی) ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے!“

اب سے لگ بھگ اٹھارہ برس قبل ان سطور کا راقم مسجد خضراء من آباد میں اسٹکف کی حالت میں امت مسلمہ کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ اچانک یہ حدیث مبارک ذہن میں بجلی کی طرح کوند گئی اور اس نے بعینہ وہ کام کیا جو ایک بہت بڑے خزانے کو کھولنے کے لئے ایک چھوٹی سی کنجی کرتی ہے۔ چنانچہ فوراً امت کی چودہ سو سالہ تاریخ کا ایک خاکہ نوشتہ دیوار کی طرح نگاہوں کے سامنے آگیا اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے جن چار ادوار کا ذکر سورہ بنی اسرائیل کی ابتدائی چند آیات میں ہوا ہے وہ ایک اعتبار سے۔

”خوشتر آں باشد کہ ستر دلبریں

گفتہ آید در حدیث دیگران“

کے مصداق خود امت محمد علیؐ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کا پیشگی بیان

ہے۔ اس سے جہاں اس حدیث مبارکہ کی عظمت کا نقش دل پر قائم ہوا وہاں اس حدیث نبوی کی حقانیت بھی مزید منکشف ہوئی جس میں آنحضور ﷺ نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

فَیَسِّرْ نَبَأَ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبِّرْ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَهُمَا
 ”اس میں تم سے پہلے کے لوگوں کے حالات بھی درج ہیں اور تمہارے بعد آنے والوں کے حالات کا ذکر بھی موجود ہے اور تمہارے مابین رونما ہونے والے جملہ نزاعات کا فیصلہ بھی موجود ہے“ (ترمذی اور بیہقی عن علیؑ ابن ابی طالب)۔

بہر حال ذیل میں امت مسلمہ کے عروج و زوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ ایک طرف ”عروج“ کے ضمن میں ملت اسلامی کی عظمت و سطوت گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ۔

کبھی اے نوجوانِ مسلم تدر بھی کیا تو نے؟

وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبرائیل (جبریل الطارق) سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی وی آنا کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں۔ شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دل میں ملت اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت و سطوت گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے!۔۔۔۔۔ اور دوسری طرف ”زوال“ کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر مبدل۔ اس نے جو معاملہ سابق امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہ وہی ہمارے ساتھ کیا، حتیٰ کہ ہماری اور ان کی تاریخ میں ایک حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دور آئے۔ اگرچہ امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وسعت کی نسبت سے ہمارے عکبت و ادبار کے یہ دور بھی یہود کے مقابلے میں بہت

طویل رہے اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ۔

”اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک“ کے مصداق دو بار چاک ہوا اسی طرح ہمارے عہد تولیت میں بھی مسجد اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

امت مسلمہ کے عروج و زوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیش کی جانی چاہئیں: ایک یہ کہ جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، اپنی ہیست تکلیلی کے اعتبار سے امت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو حصے ہیں۔ پہلا ”ایمین“ یعنی بنی اسماعیل پر مشتمل ہے اور اسے اس امت کے قلب یا مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور دوسرا ”آخرین“ یعنی دیگر اقوام پر مشتمل ہے خواہ وہ کرد ہوں یا ترک، اہل فارس ہوں یا اہل ہند، افغان ہوں یا مغل، اہل حبش ہوں یا بربر، شرق بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغرب بعید یعنی مراکو اور موریطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالم اسلام کو تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہئے، یعنی ایک قلب، دوسرے مینہ اور تیسرے میسرہ۔ اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالم اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محو پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب، عراق، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک جو عالم اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے کو اس کے دم کے پھیلے ہوئے پروں سے۔ اس عقاب کا دایاں بازو (مینہ) ایران، ترکستان، افغانستان اور برصغیر ہند و پاک سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور دایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہوا چین تک چلا گیا ہے۔

اب آئیے تاریخی خاکے کی طرف:

سن عیسوی کے حساب سے امت مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے، اس لئے کہ آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء میں ہوئی۔ ۶۱۰ء میں آپ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل ۶۳۲ء میں آپ ﷺ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل فرما کر ”رفیق اعلیٰ“ سے جا ملے، فَصَّلَى اللہ علیہ وبارک و سلم تسلیماً کثیراً۔ خلفاء ثلاثہ یعنی حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت کے دوران ”ایمیین“ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران و عراق، شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں تو یہ عمل رکا رہا لیکن بنو امیہ کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان، افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ ”ایمیین“ کے زیر نگیں آگیا اور عالم اسلام کی سرحدیں تین براعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں۔

آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دور ہے جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالم اسلام کی سیادت دونوں ”ایمیین“ کی دو اہم شاخوں یعنی بنو امیہ اور بنو عباس کے پاس رہیں اور روئے ارضی کے ایک بڑے حصے پر ان کے دین و مذہب، ان کے تہذیب و تمدن، ان کے علوم و فنون اور ان کی شان و شوکت کا سکھ رواں رہا۔ لیکن جیسے جیسے دنیوی جاہ و جلال میں اضافہ ہوا، جذبات دینی اور حرارت ایمانی میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت ضرور صرف ہوئی لیکن دسویں صدی

عیسوی ہی کے دوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنے عالم پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی کے دوران ”ایبٹین“ کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا اور اس طرح عالم اسلام کے قلب میں قوت کا ایک خلا پیدا ہو گیا۔

خوش قسمتی سے قوت کے دباؤ میں اس کمی کے نتیجے میں عالم اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلب اسلام کی طرف کھینچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے یعنی کرد اور ترکمان سلجوقی جنہوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران شام، فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالم اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لئے کسی قدر تازہ دم قوت فراہم ہو گئی۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران میں امت مسلمہ پر گویا عذاب خداوندی کے ”وعدہ اولیٰ“ کا ظہور ہوا اور ہو ہو وہی نقشہ کھینچ گیا جس کا ذکر سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۵ میں تاریخ بنی اسرائیل کے پہلے دور عذاب کے ضمن میں آیا ہے۔ چنانچہ پہلے شمال سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے اور ۱۰۹۹ء میں نہ صرف یہ کہ مسجد اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا بلکہ بیت المقدس میں وہ قتل عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا۔ اس لئے کہ دولت عباسی تو ”مرنے والی امتوں کے عالم پیری“ کا نقشہ پیش کر رہی تھی گویا ”ایبٹین“ میں تو سرے سے دم خم باقی ہی نہ رہا تھا۔ بالآخر ”آخرین“ کے تازہ و گرم خون نے مجاہد کبیر صلاح الدین ایوبی کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی اور اس طوفان کا رخ موڑا۔۔۔۔۔ اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنہ تاتار کا وہ طوفان عظیم جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشے لگا دیئے اور بالآخر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تیرتھ ہوئے، بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور بینہ وہ کیفیت پیدا ہو گئی جو کم و بیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس

کی ہوئی تھی۔ نتیجہً زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین کے ساتھ ہی خلافتِ عباسی کا غمناک ہوا چراغ بالکل گل ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ امتِ مسلمہ پر عذابِ خداوندی کا یہ پسدادور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم از کم ”اسیین“ کی حد تک تو وہ وعید بھی پوری ہو گئی جو سورہٴ محمد ﷺ آیت ۳۸ میں وارد ہوئی تھی کہ ”إِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ“ یعنی ”اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو (اللہ) تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا“ چنانچہ وہ عالمِ اسلام کی سیادت و قیادت کے منصب سے معزول کر دیئے گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۶۰ء میں اس طوفانِ کارِ بھی ”آخرین“ ہی نے پھیرا جس سے کم از کم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران عالمِ اسلام کا قلبِ بعینہ وہی نقشہ پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ ”اَنْتِیْ یُحْیِیْ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا“ یعنی ”کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے“ اس کی موت کے بعد! (البقرہ: ۲۵۹) لیکن پھر امتِ مسلمہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا ظہور بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ امتِ مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہذا اس کی نشاۃ ثانیہ کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی نسل کے اندر واقع ہوا، لیکن امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی، لہذا یہاں تجدیدِ ملت کا یہ کام ”آخرین“ کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ۔

”ہے عیاں فتنہٴ تادم کے افسانے سے

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!“

کے مطابق نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکانِ چنگیزی کا بڑا حصہ اسلام لے آیا جن کے ہاتھوں عالمِ اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ حلقہٴ گورِشِ اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکانِ تیوری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالمِ اسلام کے

دائیں بازو کی توسیع کی اور دوسرے یعنی ترکین عثمانی نے ابتدائے ایشیائے کوچک میں قدم جمائے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پورے مشرقی یورپ پر اپنی بالادستی کا سکہ جلیا، یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک پر دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالم اسلام کے قلب کی حفاظت و سیادت کی ذمہ داری سنبھالی تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا اور اس طرح گویا عالم اسلام کے قلب کی عظمت و سطوت گزشتہ پھر پوری طرح لوٹ آئی، اگرچہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں کے واسطے سے!

قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ ادھر تو خلافت عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالم اسلام کے قلب میں گویا ملت کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور اُدھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں امت مسلمہ پر عذاب الہی کے دوسرے اور نہایت طویل دور کا آغاز ہو گیا جس کا اصل زور عالم اسلام کے میسرہ اور مہمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء العلوم کا پورا عمل اسلام ہی کے زیر اثر شروع ہوا اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق و مغرب کے علوم و فنون سے روشناس کرایا۔ لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری ہوئی اور وہاں قوت کا دباؤ بڑھا گویا عالم اسلام کی شامت آگئی۔

یورپ مشرق و مغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا، لیکن مشرق میں عذاب کے وعدہ اولیٰ کے بعد نشاۃ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنت عثمانیہ عالم اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی البتہ مغرب میں اب دولت ہسپانیہ ”مرنے والی امتوں کے عالم پیری“ کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ لہذا ”جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات“ کے مصداق یورپی استعمار کا اولین شکار وہی بنی اور پندرہویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد تو بعینہ وہ صورت پیدا ہو گئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذابِ استیصال کا نوالہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے: ”كَانَ لَمْ يَفْتَنُوا

فِيهَا" یعنی "جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے" (سورہ ہود: ۶۸ اور ۹۵) اور "لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاجِدُهُمْ" یعنی "اب ان کے دیران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا" (سورہ الاحقاف: ۲۵)

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالم اسلام کے مہم پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا، ملایا اور ہندوستان مختلف یورپی اقوام کے استبدادی پنچوں میں جکڑے گئے اور یہ عمل جس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا، اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج کو پہنچ گیا۔

اسی اثنا میں دولت عثمانی بھی اپنے شباب کے دور سے گزر آئی تھی اور اب اس نے بھی "مرد بیمار" کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ گویا عالم اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہو گیا جو گیارہویں صدی عیسوی میں دولت عباسیہ کے انحلال کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رخ عالم اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا۔

عالم اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولت عثمانیہ سمٹ سٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہو گئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالم عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہ راست زیر نگیں ہو گیا یا بالواسطہ محکومی میں آ گیا اور ہو ہو وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس کی خبر مخبر صادق ﷺ نے ان الفاظ میں دی تھی کہ: "يُوشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَّاعِيَ عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَّاعَى الْأَكَلَةُ إِلَىٰ قَصْعَتِهَا" یعنی "ایک زمانہ آئے گا کہ اقوام عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے (کسی دعوت طعام میں) کھانے والے ایک دوسرے کو دسترخوان کی طرف بلا رہے ہیں!"

اس طرح بحیثیت مجموعی امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دورِ ثانی اس صدی

کے ربع اول میں اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گیا تھا جبکہ پورا عالم اسلام مغربی استعمار کے ہٹاکے شکنجے میں جکڑا گیا، اگرچہ خاص ”اسٹین“ کے حق میں ”وَعْدُ الْآخِرَةِ“ کی وہ مکمل صورت جو سورہ یٰسٰرٰئیل کی آیت ۷ میں بیان ہوئی تھی تقریباً نصف صدی بعد ۱۹۷۷ء میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب و ملعون قوم کے ہاتھوں ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست دلوائی اور عربوں کے عہد تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجد اقصیٰ کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہو گا۔ اس داستان کا الٹا ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے امت مسلمہ کی وحدت ملی کو پارہ پارہ کر دیا اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بودیئے جو ابھی تک برگ و بار لا رہے ہیں، چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا۔ نتیجہ عالم اسلام کا قلب دو ٹوٹ ہو گیا اور وحدت ملی کی علامت یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پھر عالم عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالم عرب کے کمال اتحاد کا امکان تاحال دور دور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی امت مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ ”يَلْبِسْكُمْ شَيْعًا وَيُذِيقْ بَعْضُكُم بَأْسَ بَعْضٍ“ یعنی ”تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور پھر چکھائے ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ“ (سورۃ الانعام آیت ۶۵) چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر اے میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جلن و مال اور عزت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشم فلک نے دیکھا۔
فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ ۝۰

بیسویں صدی عیسوی: سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں

بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بھی تاریخ میں یادگار رہے گی کہ اس کے اوائل میں عظیم سلطنت عثمانیہ کے پرزے اڑ گئے اور اواخر میں عظیم سوویت یونین کی دھجیاں بکھر گئیں، لیکن ہمارے موضوع کے اعتبار سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس کے دوران معزول شدہ اور موجودہ مسلم امتوں یعنی یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے ضمن میں دو بالکل مخالف اور متضاد کیفیات کا عمل دخل بالکل اسی شان کے ساتھ جاری رہا جو سورۃ الرحمن کی آیات ۱۹-۲۰ میں بیان ہوئی ہے یعنی مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ ۝ (ترجمہ: ”چلائے دو دریا ایک دوسرے سے متصل لیکن ان کے مابین ایک پردہ حائل ہے جس کے باعث وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں آسکتے“)۔ یعنی ایک جانب ان دونوں پر اللہ کے عذاب کے دورِ ثانی کا وہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ بعض اعتبارات سے شدید تر ہو گیا جو یہودیوں کے معاملے میں تو لگ بھگ دو ہزار برس سے جاری تھا اور مسلمانوں کے معاملے میں بھی کئی صدیوں سے چلا آ رہا تھا، لیکن دوسری جانب ان دونوں ہی امتوں میں ایک احیائی عمل بھی شروع ہوا اور دونوں ہی بعض اعتبارات سے تیزی کے ساتھ ترقی اور عروج کی جانب بڑھتی نظر آئیں۔

واضح رہے کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ کے قانونِ عذاب کی جو تفصیل بیان ہو چکی ہے اس کے مطابق یہودی اب سے لگ بھگ دو ہزار برس قبل عذابِ استیصال کے مستحق ہو چکے تھے، اس لئے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ان کی جانب رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے، جیسے کہ سورۃ آل عمران کی آیت ۴۹ اور سورۃ الصف کی آیت ۶ میں

صراحتاً مذکور ہے، لیکن یہودیوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا انکار کیا بلکہ ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم صدیقہ سلام علیہا پر بدکاری کا الزام عائد کیا، اور خود آں جناب کو جادوگری اور ارتداد کے الزامات کے تحت واجب القتل قرار دیا اور اپنے بس پڑتے تو انہیں سولی پر چڑھا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر آپ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا اور (انجیل برنباس کے مطابق) آپ کی صورت میں درحقیقت آپ کے اس غدار حواری یہوداہ اسکریوتی کو سولی چڑھا دیا جس نے سونے کے تیس سکوں کے عوض بخبری کر کے آپ کو گرفتار کرایا تھا۔ تاہم ایک خاص حکمت کے تحت (جس کا ذکر بعد میں آئے گا) اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس آخری سزا کی تنفیذ کو مؤخر رکھا۔ سورہ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی آیت ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے موقع پر اللہ نے آپ ﷺ کی رحمت للعالمین کے صدقے یہود کو بھی ایک موقع توبہ کا عنایت فرمایا تھا، فرمادے: ”عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُذْتُمْ عُنَدَنَا“ یعنی ”تمہارا رب اب بھی تم پر رحم فرمانے کے لئے آمادہ ہے، لیکن اگر تم نے سابقہ روش پر قرار رکھی تو ہم بھی وہی کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں!“ یہ گویا جدید عدالتی اصطلاح میں ایک رحم کی اپیل کا آخری موقع تھا جو یہودیوں نے اپنی سرکشی کے باعث گنوا دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آخری فیصلہ صادر فرمادیا:

وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ لَسَبْعَشْرَ عَلَيْهِمُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ
سُوءَ الْعَذَابِ (الأعراف: ۱۶۷)

”جب اعلان کر دیا میرے رب نے کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں بدترین عذاب دیتے رہیں گے!“

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کا سب سے نمایاں مظہر اس بیسویں صدی کے وسط میں سامنے آیا جب ہٹلر نے نہ صرف جرمنی بلکہ مشرقی یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے ساتھ لاکھ یہودیوں کو ایسے سپیشل گیس چیمبرز اور ایکسٹرمینیشن پلانٹس کے ذریعے نیست و نابود کیا جن کی نظیر غالباً پوری انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن دوسری جانب یہ معجزہ بھی اسی بیسویں صدی میں ظاہر ہوا کہ جو ملعون و مغضوب قوم دو ہزار برس سے درہم و برہم

ری تھی اور کہیں امان نہیں پاری تھی اسے دوبارہ اپنے خوابوں کی سرزمین یعنی فلسطین میں پاؤں جمائے کا موقع ملا۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے عربوں سے جو بغاوت ترکوں کے خلاف کرائی تھی جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ عظیم سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا بلکہ مسلمانانِ عالم کی وحدت ملی کا نشان یعنی خلافت کا ادارہ بھی ختم ہو گیا، اس کا ”انعام“ انہیں حکومت برطانیہ کی جانب سے ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کے ”اعلانِ بالفور“ کی صورت میں ملا، جس کے نتیجے میں پہلے سرزمینِ فلسطین میں یہودیوں کی آباد کاری ہوئی اور بالآخر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا خنجران کے سینے میں پوسٹ کر دیا گیا۔ گویا کہ یورپی استعمار کی صورت میں موجود امت مسلمہ پر اللہ کی جو سزا گزشتہ تین صدیوں سے تدریجاً بڑھ رہی تھی اس کے آخری اور شدید ترین دور کا ”آغاز“ ہو گیا۔ یعنی امت مسلمہ کے افضل ترین حصے یعنی عربوں پر اللہ کی ایک مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں ذلت آمیز شکستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی پہلی قسط تو ۱۹۴۸ء ہی میں مل گئی تھی جب انگریزی فوج کے فلسطین سے نکلنے ہی عربوں اور یہودیوں میں جنگ شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں بجائے اس کے کہ یہودیوں کو کوئی نقصان پہنچتا وہ اس رقبے سے بھی زیادہ پر قابض ہو گئے جو انہیں تقسیم کے فیصلے کے تحت ملا تھا!

”اسپین“ پر اللہ کے عذاب کا دوسرا اور شدید تر کوڑا لگ بھگ بیس برس بعد ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں نہایت ذلت آمیز ہی نہیں، حد درجہ شرمناک شکست کی صورت میں پڑا، جس کے نتیجے میں ۱۹۴۸ء میں قائم ہونے والے اسرائیل نے ”عظیم تر اسرائیل“ کی جانب مزید پیش قدمی کر لی اور مصر، شام اور اردن سے اضافی علاقے ہتھیا لئے۔۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مذہبی مرکزِ یروشلم پر بھی قبضہ حاصل کر لیا۔

”آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا“

قصہ مختصر: بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب سابقہ اور معزول شدہ امت مسلمہ یعنی یہودیوں پر اللہ کے آخری عذابِ استیصال کا سرسل یا ٹریلر بھی ”ہالوکاسٹ“ کی صورت میں سامنے آگیا اور دوسری طرف ان کے اس آخری عروج کی جانب بھی نمایاں

پیش قدمی ہو گئی۔ جس کا کوئی سان گمان بھی ایک صدی قبل نہیں ہو سکتا تھا۔
 یہی معاملہ موجودہ امت مسلمہ کے ساتھ پیش آیا کہ جہاں ایک جانب اس صدی کے آغاز میں سلطنت عثمانیہ اور خلافت اسلامی کے خاتمے اور پھر ۱۹۱۹ء میں عربوں کی عبرتاک ہزیمت اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور ۱۹۴۷ء میں ”آخرین“ کے اہم ترین اور عظیم ترین ملک یعنی پاکستان کی شکست و ریخت اور ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک ہزیمت کی صورت میں عذاب الہی کے سائے مزید گہرے ہو گئے جن پر مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی تھی وہاں دوسری جانب یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اس صدی کے ربع اول کے خاتمے کے لگ بھگ جب امت کے ایک حساس اور دردمند فرد کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی یہ درد انگیز صدا ایک تلخ حقیقت کا روپ دھار چکی تھی کہ

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
 اسلام کا رگر کر نہ ابھرتا دیکھے
 ملنے نہ کبھی کہ مد سے ہر جز کے بعد
 دنیا کا طارے جو اترتا دیکھے

رحمت خداوندی میں جوش اچکا تھا اور تاریخ باقہ ایک کردار نے چلی تھی جس کے نتیجے میں پورے عالم اسلام میں ایک احيائي عمل شروع ہو گیا جس کا کسی قدر تفصیلی جائزہ بہت ضروری ہے تاکہ مایوسی کے سائے زیادہ گہرے نہ ہوں اور حالات کے تاریک رخ کے ساتھ ساتھ روشن پہلو بھی لگا ہوں گے سائے موجود رہے۔

اس احيائي عمل کے بارے میں بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں۔ مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں سرگرم ہیں اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احيائي عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے باعث تقویت ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں بلکہ سورۃ

الاشقاق کی آیت ۱۹: "لَتَرْجَبَنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" یعنی "تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ" کے مصداق تدریجاً بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا لہذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل میں پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے بقول علامہ اقبال۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع حیاتی عمل کی پٹائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

اس حیاتی عمل کا اولین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہ راست تسلط سے نجات کا حصول تھا جو بحمد اللہ گزشتہ چالیس پچاس سال کے دوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوام مغرب کی سائنسی و تکنیکی بلا دستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیہ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریتریا کے علاوہ پورے کرہ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہ راست غلامی و محکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی و نظریاتی اور تصورات پسندانہ نقطہ نظر سے تو "مسلمان اقوام" کی اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے، اس لئے کہ اذروئے قرآن و حدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا امت یا حزب کی ہے نہ کہ قوم کی لیکن واقعیت پسندانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا امت یا حزب کا کردار تو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ وحدت ملی کا تصور اس

صدی کے آغاز تک برقرار تھا، لیکن اس صدی کے رُبعِ اول کے دوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اس وقت فی الواقع روئے ارضی پر کوئی ایک امتِ مسلمہ آباد نہیں ہے بلکہ بہت سی مسلمان اقوام آباد ہیں۔

اسی طرح خالص تصوریت پسندانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ”نشرِ رائے کو تعلق نہیں پیتا ہے“ کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھئے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل ہی نئی قوم کے حوالے فرما دے اور ”يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ“ یعنی ”بدل دے تمہاری جگہ کسی اور قوم کو“ (سورہ محمد ﷺ) کی شان دوبارہ ظاہر ہو۔۔۔۔۔ لیکن بحالات موجودہ تو ”کہیں ممکن ہے کہ ساتی نہ رہے، جام رہے“ کے مصداق اسلام کا مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور دونوں باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اندریں حالات مسلمان اقوام کا آزادی و خود مختاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سر ہوا ہے ان کی سچی بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہی کی جدوجہد کا جزو قرار پائے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا تو اسی کا جواب ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ مبارکہ میں کہ ”إِنَّ اللَّهَ لَيُؤَيِّدَ هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ“ یعنی ”یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت غیر متقی انسانوں سے بھی لے لیتا ہے“ (بخاری کتاب الجہاد، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصول آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لئے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال کیا گیا انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظام فکر کے ساتھ سوائے تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے لیکن عالم واقعہ میں اس کے سوائے کوئی چارہ کار موجود نہ تھا، اس لئے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی و قلبی رشتہ اتنا تقویٰ نہ

رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعال تحریک کی اساس بنایا جاسکتا اور حصول استقلال کے لئے جس موثر مزاحمت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہو گیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام و نشان بھی صفحہ ارضی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اس وقت مسلمان عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں، اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے لئے واحد ممکن بنیاد بن سکتا تھا اور ایک واقعی ضرورت اور وفاقی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے، بشرطیکہ اسے نظام فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کر لیا جائے اور حصول آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدت ملی کے شعور و احساس کو اجاگر کیا جائے۔

اس پس منظر میں دیکھتے تو تحریک پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کرتے تو اس کے لئے بھی وجہ جواز موجود تھی (چنانچہ جمعیت علمائے ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی، بلکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی خود نوشت سوانح ”نقش حیات“ میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ مسلمان پنجاب کو ”سکھاشاہی“ سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے!) لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات کے باعث مسلمان ہند نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز ”مسلم قومیت“ کی اساس پر کیا جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا جو حضرت سلمان فارسیؒ کی طرح جو اپنا نام ”سلمان ابن اسلام“ بتایا کرتے تھے، صرف اور صرف ”فرزند اسلام“ قرار دیا جاسکتا ہے اور جس کے قیام کے لئے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان صر ”خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی“ (ﷺ) کے مصداق اپنی پیدائش اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے تمام مسلمان ممالک

سے ایک قدم آگے ہے۔

مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد کو اس رخ پر ڈالنے والے اسباب و عوامل میں سلبی و منفی طور پر سب سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لینے کے اس جذبے کو حاصل ہے جو ان کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرز عمل بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ممد و معاون بن گیا اور ہم اپنے سابق اینائے وطن کی خدمت میں بجاطور پر عرض کر سکتے ہیں کہ۔

تو نے اچھا ہی کیا دوست سارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک تو یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبہ ملی باقی تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنبیخِ خلافت پر جس قدر شدید ردِ عمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عشرِ عشر بھی کہیں اور نہیں ہوا حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدوجہد کا عنوان ہی ”تحریکِ خلافت“ بن گئی تھی۔۔۔۔۔ اور دوسرے یہ کہ اس خطے میں علامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جس کی انتہائی پرورد اور پُر تاثیر مدی خوالی نے قافلہ ملی کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا اور مسلمانانِ ہند کو جذبہ ملی سے سرشار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ملی شاعری کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کی وسیع الاطراف جدوجہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ۱۹۷۴ء میں عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی خیز تھا جہاں قریباً نصف صدی قبل قراردادِ پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلہ ملتِ اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا گاتا رہا کہ:۔

بیا تا کارِ این امت بسازیم
 قمارِ زندگی مردانہ بازیم
 چنلِ نالیم اندر مسجدِ شہر
 دلے در سیدہ ملا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر ہندوپاک کو پورے عالم اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے، چنانچہ علماء دین کو جس قدر اثر و رسوخ یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا اور راسخ العقیدہ اسلام جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا (۶۸ء میں جو انجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمن مرحوم کی کتاب ”اسلام“ کے خلاف ہوا تھا اور پھر ۷۴ء میں جو مجرہ قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں) حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب بھی جہاں اس صدی کے وسط تک محمد ابن عبدالوہاب کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے!

اس کی وجہ بھی باڈنی تامل سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علم دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکرِ اسلامی کی تدوین نو کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجالِ دین کی ساکھ از سر نو مضبوط ہو گئی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ علماء دین کی مساعی میں اصل زور دورِ حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی حفاظت و مدافعت پر ہے۔ اس طرح ان

کی خدمات کو سابق مجددین اسلام کی مساعی کے ساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے، اس لئے کہ جملہ مجددین امت کی مساعی کی اصل نوعیت بھی احیاء دین یا اقامت دین کی نہیں بلکہ حفاظت و مدافعت دین ہی کی تھی اور یہ اس لئے کہ ابھی اسلام کا قصر عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا اور خواہ دین کی حقیقی روح کتنی ہی مضحل اور پژمرده ہو چکی ہو بہر حال اسلام نے جو تہذیبی اور قانونی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار تھا حتیٰ کہ شریعت اسلامی اکثر مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی۔ چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظام عقائد و اعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور تک کے تمام مجددین امت علیم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقائد و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو ان کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاح اخلاق و اعمال، تزکیہ نفس اور تربیت روحانی تک۔ اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجدد دین کی جدوجہد نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔

اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ”خروج“ یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عائد فرمادی تھیں اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعت اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی ”کفر بواح“ یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج و تحفیض نہیں ہو رہی تھی ان کے ذاتی فسق و فجور اور ظلم و جور کے باوجود ان کے خلاف مسلح بغاوت ممکن نہ تھی۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورت حال تبدیل ہوئی اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی دفعۃً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہو گئی جس کی سب سے شاندار اور تابناک مثال خانوادۂ ولی اللہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریک شہیدینؒ ہے۔ عالم عرب میں اس کی متوازی تحریکوں کے طور پر ممدی سوڈانیؒ اور شیخ سنوسیؒ کی مساعی کو شمار کیا جاسکتا ہے۔

البتہ یہ حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ عہدِ حاضر میں بالخصوص برِ عظیمِ پاک وہند میں علماء کرام کی خدمات و اعتبارات سے اصلاح طلب بھی ہیں؛ مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دور اوزہ بند ہوا اور تقلیدِ جلد کا دور دورہ ہوا اور تشکیک و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جمائے، ہر فرقے کے علماء کرام دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو ان کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے، جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دوسرے چونکہ انہوں نے علومِ جدیدہ اور دورِ حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہِ راست اور بلاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دور میں امامِ غزالیؒ اور امامِ ابن تیمیہؒ نے کیا تھا لہذا وہ دورِ حاضر میں حفاظت و مدافعتِ دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ گویا دورِ حاضر میں علماء دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے البتہ کم از کم برِ عظیمِ پاک وہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لتکر کی ضرور ہے جو اس کشتی کو غلط رخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہر حال سرانجام دے سکتا ہے اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے۔

برِ عظیم میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی کتبِ فکر کو حاصل ہے جو امامِ ہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ”فکر“ ”کانہ سہی“ ”علم“ کا وارث ضرور ہے اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ توجہات کو حقائقِ ایمانی پر مرکوز کر دیا اور جس کے زیر اثر کم از کم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہو رہے ہیں جن کے اذہان فکری و نظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی میں سہی بہر حال موجود ضرور ہوتا ہے۔ ہماری مراد ”جماعتِ تبلیغی“ سے ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکتِ عالمِ اسلام ہی نہیں، دیارِ غیر میں بھی برپا کر دی ہے اور جس کے

زیر اثر عوامی سطح ہی پر سہی بہر حال ”تجدیدِ ایمان“ کی ایک تحریک بالفعل برپا ہو گئی ہے اور جسے بلاشبہ زیر بحث ہمہ جہتی احيائی عمل میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ حال ہی میں بعض دوسرے مذہبی حلقوں نے بھی اسی طرز پر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اللہ کرے کہ اس سے فرقہ واریت کو فروغ نہ ہو بلکہ ایمان کی باطنی کیفیات اور شعائرِ اسلامی کی پابندی کو تقویت حاصل ہو۔

اس ”ہمہ جہتی احيائی عمل“ کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں سرکار ہیں جو قائم ہی خالص احيائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احيائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجہش کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن۔ ”ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم“ اور ”ہے ایک ہی نغمہ کہیں اوچا کہیں مدھم“ (جناب نعیم صدیقی) کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی الاخوان المسلمون، توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ احيائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برِ عظیم ہندوپاک ہی کو حاصل ہے۔

برِ عظیم میں اس تحریک احيائے دین کے مؤسس اولین اور داعیِ اول کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں ”الہلال“ اور ”البلالغ“ کے ذریعے ”حکومتِ الہیہ“ کے قیام اور اس کے لئے ایک ”حزبِ اللہ“ کی تائیس کی پر زور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے، خصوصاً تحریک خلافت کے دورِ ان میں، ان کی شہرت کو برِ عظیم کے طول و عرض میں پھیلا دیا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا، لیکن اس کے بعد بعض وجوہ کی بناء پر، جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے، انہوں نے دفعۃً اس عظیم مشن کو خیر یاد کہہ کر

انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔ (راقم نے اس موضوع پر مفصل بحث اپنی تالیف ”جماعت شیخ الہند“ میں کی ہے)

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تو میدان چھوڑ گئے، لیکن ان کی زوردار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضا میں دیر تک گونجتی رہی اور پھر کم و بیش دس ہی سال بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزم مصمم کے ساتھ ان کی تفسیر ”ترجمان القرآن“ ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اسی ”حکومت الہیہ“ کے قیام کا نصب العین اور ”تجدید و احیائے دین“ کی سعی کا ایک نقشہ مسلمان ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا اور پہلے چھ سات برس تک پورے صبر و استقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا۔ پھر کچھ عرصہ ”دارالاسلام“ کے نام سے جو ادارہ علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند چوہدری نیاز علی خاں نے قائم کیا تھا اس کے تحت کام کیا اور بالآخر ۱۹۴۱ء میں ”جماعت اسلامی“ کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظم جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

سب جانتے ہیں کہ کئی صدیوں سے عالم اسلام میں علمی و ثقافتی مراکز ڈوبی رہے ہیں: عالم عرب میں مصر، اور غیر عرب مسلم دنیا میں ہندوستان۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکیں بھی ان ہی دو ملکوں سے اٹھیں۔ لیکن تقریباً نصف صدی کے عرصے میں مصر کی تحریک اسلامی کے اثرات تمام عرب ممالک تک پہنچ گئے جن میں کم و بیش بیس پچیس کروڑ مسلمان آباد ہیں اور ہندوستان تو تھا ہی ایک بڑے عظیم جس کے چار کٹوں میں (اس لئے کہ اب کشمیر بھی بالقوہ تو بھارت سے جدا ہو ہی چکا ہے) لگ بھگ چالیس کروڑ مسلمان آباد ہیں جن کی نوجوان نسل کا معتد بہ حصہ تحریک اسلامی کے زیر اثر آیا ہے۔ ایران کا معاملہ خود اپنی جگہ ایک جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ اس صدی کے آغاز تک وہ باقی مسلم دنیا سے الگ تھلگ گویا اپنے ہی خول میں بند تھا۔ پھر دوسرے ممالک کی احیائی

تحریکوں کی فہرست میں ایران کے ”فدائین“ کا بھی ذکر سنائی دیا۔ لیکن اس کے بعد پھر کچھ خاموشی طاری رہی، تا آنکہ اچانک ایک طوفان کی سی کیفیت کے ساتھ ایران میں انقلاب آیا اور وہ بعض اعتبارات سے تو پوری مسلم دنیا سے آگے نکل گیا۔ مزید برآں ان تمام مسلمان ممالک سے جو نوجوان ساٹھ کی دہائی میں حصول تعلیم کے لئے امریکہ، انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک گئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے ان کے ذریعے ان تحریکوں کے اثرات مغربی دنیا میں بھی قابل لحاظ و احساس حد تک پہنچ چکے ہیں، چنانچہ مغرب ان ہی کو ”مسلم فڈامینٹلسٹ“ کے نام سے پکار رہا ہے اور ان سے اپنی ”مثالی“ تہذیب و تمدن کو خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ (فرعون نے بھی سورہ طہ کی آیت ۷۳ کی رو سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو اپنی ”مثالی“ تہذیب کے لئے خطرہ قرار دیا تھا) اور اس امر سے قطع نظر کہ ان تحریکوں کی نصف صدی سے زائد کی مساعی کا حاصل کیا ہے اور پالیسی اور طریق کار کے بارے میں اختلافات کے سبب سے یہ کتنی شاخوں میں تقسیم ہوئی ہیں، جیسے مثلاً عالم عرب میں مصر اور اردن میں بحیثیت مجموعی تو اخوان کے پُر امن میانہ روی اختیار کی اور سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کو اپنی پیش رفت کا ذریعہ بنایا، لیکن ان ہی سے علیحدگی اختیار کرنے والے زیادہ ریڈیکل عناصر نے تشدد اور دہشت گردی کا راستہ اختیار کر لیا جیسے مصر کی کچھ عرصہ قبل کی ”انکفیر و الحجہ“ اور حالیہ ”جماعہ اسلامیہ“۔ (اکتوبر ۱۹۷۹ء میں راقم نے قاہرہ میں اخوان کے مرشد عام عمر تلمسانی مرحوم سے ملاقات کی تھی تو انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ ”انکفیر و الحجہ“ اخوان ہی کے لوگ ہیں جو ہم سے علیحدہ ہو کر دہشت گردی کے راستے پر چل نکلے ہیں) اسی طرح اردن ہی کے تقی الدین ہسانی مرحوم نے کہیں زیادہ ریڈیکل ”حزب التحریر“ کی بنیاد رکھی۔ بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ یہ تحریکیں مجموعی اعتبار سے عالم اسلام میں احیاء اسلام کی امنگ کا مظہر ہیں اور اب عالمی سطح پر انہیں ایک امر واقعی کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔

الغرض، بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب تو سابقہ اور معزول شدہ امت مسلمہ یعنی یہود اور موجودہ امت مسلمہ یعنی مسلمانوں پر عذاب الہی کے کوڑے بھی برستے

رہے، لیکن دوسری جانب یہودی بھی دو ہزار سالہ باسی کڑھی میں اہل آیا اور وہ صیہونی تحریک کی زیر قیادت "ارض موعود" میں قدم جما کر عظیم تر اسرائیل کے قیام اور پیکل سلیمانی کی تعمیر نو کی جانب پیش قدمی کے لئے پرتول رہے ہیں، اور خود مسلمان بھی مغربی استعمار کی کم از کم براہ راست غلامی سے نجات پا کر (اس لئے کہ ابھی ریموٹ کنٹرول بہ تمام و کمال موجود ہے) اپنے دین کے احیاء اور اسلامی نظام حیات کے ہمہ وجہ قیام ہی نہیں، عالمی غلبہ دین کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اس صدی کی آخری دہائی کے بقیہ حصے میں جو عظیم واقعات و حوادث رونما ہونے والے ہیں ان کی تہہ میں اصلاً ان ہی دو امتوں کی آخری آویزش کار فرما ہوگی۔ اگرچہ اس میں بظاہر زیادہ اہم اور نمایاں کردار ایک تیسری امت ادا کرے گی جو ابراہیمی مذاہب کے "خالٹ ٹلاش" یعنی تین میں کے تیسرے کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا اس سے قبل کہ مستقبل کے واقعات و حوادث کے بارے میں کچھ بات کی جائے کسی قدر گفتگو اس تیسری امت کے بارے میں ضروری ہے۔

۵ مئی ۱۹۹۳ء

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابراہیمی مذاہب کا ”ثالث ثلاثہ“

”ثالث ثلاثہ“ کے الفاظ قرآن حکیم میں سورۃ المائدہ کی آیت ۳ میں عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں یعنی ”لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثٍ“ (ترجمہ: ”یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے!“)۔ ”ثَالِثُ ثَلَاثٍ“ (”تین میں کا تیسرا“) کے ان الفاظ میں ایک طنز اور تعریض مضمر ہے، جس کے فہم کے لئے اس حقیقت کی جانب توجہ ضروری ہے کہ اگرچہ تمام مشرکانہ مذاہب کے عقائد میں یہ قدر مشترک لازماً موجود ہوتی ہے کہ اوپر ایک بڑے خدا کو مان کر اس کے نیچے بہت سے چھوٹے خداؤں کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن پھر اصل خدائی چھوٹے خداؤں ہی کی ہوتی ہے، بڑا خدا تو بس ایک ”دستوری سربراہ“ بن کر رہ جاتا ہے (جیسے ٹھیکہ پارلیمانی نظام میں صدر ریاست!) چنانچہ ہندوؤں کے نزدیک ”مہادیو“ تو ایک ہی ہے جبکہ دیویاں اور دیوتا بے شمار ہیں، اسی طرح یونانی اور رومی میتھالوجی میں ”G“ سے لکھا جانے والا ”God“ تو ایک ہی ہوتا تھا لیکن ”g“ سے لکھے جانے والے gods اور goddesses ان گنت تھے۔ اسی طرح اہل عرب اللہ کو تو واحد بھی مانتے تھے، اور بلا شرکت غیرے کل کائنات کا خالق اور مالک بھی تسلیم کرتے تھے لیکن ان کے نزدیک اس کے تحت ”الہ“ بہت سے تھے جن کو اللہ نے جملہ اختیارات تفویض کر دیئے تھے۔ لیکن، جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا، پھر اصل پوجا پاٹ اور چڑھاوے اور نذرانے چھوٹی دیویوں اور دیوتاؤں اور گاؤں اور گاؤں اور ہبل یا لات و منات اور عزریٰ ہی کے لئے ہوتے تھے، بڑا خدا تو بس ”تین میں کا تیسرا“ بن کر رہ جاتا تھا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ابراہیمی مذاہب کے ضمن میں عیسائیت کا ہے کہ وہ تعدادِ نفوس کے اعتبار سے تو ابراہیمی مذاہب میں سب سے بڑا مذاہب ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمی مذاہب کی جانب اس کی نسبت صرف حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام یا زیادہ سے زیادہ ان کی ذات اور شخصیت کی حد تک محدود ہے، ورنہ عقائد و نظریات کے اعتبار سے موجودہ عیسائیت ایک بالکل جدا مذاہب ہے جس کا شمار ”فلسفیانہ مذاہب“ میں ہونا چاہئے نہ کہ ”آسمانی مذاہب“ میں، اور جس کی اصل نسبت سینٹ پال کی جانب ہونی چاہئے نہ کہ حضرت مسیحؑ کی جانب۔

بہر حال ہم جس موضوع پر سلسلہ وار کلام کر رہے ہیں اس کے اعتبار سے اس مذاہب کے نام لیواؤں کا اہم ترین رول یہ ہے کہ دونوں اصل ابراہیمی امتوں پر عذابِ الہی کے دوسرے دور میں سزا کے کوڑے بالفعل ان ہی کے ہاتھوں پڑتے رہے ہیں۔ چنانچہ سابقہ ابراہیمی امت یعنی یہود پر چوتھی صدی عیسوی کے اوائل سے لیکر جب سلطنتِ روم نے عیسائیت اختیار کی تھی بیسویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط تک، گویا سولہ سو برس سے زائد عرصے تک، تشدد و تعذیب، قتل و غارت، اور جلاوطنی اور ملک بدری کا سلسلہ مختلف عیسائی اقوام ہی کے ہاتھوں جاری رہا۔ (حالات و واقعات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس پورے عرصے کے دوران میں یہودیوں کو اگر کوئی سہولت یا سہارا حاصل ہوا تو صرف ان مسلمانوں کی جانب سے جن کے وہ بدترین دشمن ہیں۔ چنانچہ انہیں کئی سو برس بعد یروشلم میں داخلے کی اجازت ملی تھی تو حضرت عمرؓ کے فرمان کے ذریعے، پھر مکائی سلطنت کے زوال کے بعد یعنی لگ بھگ آٹھ سو برس بعد اگر انہیں کہیں امن و سکون اور چین کا سانس لینا نصیب ہوا تھا تو بنو عباس کے عہدِ خلافت میں، اور مسلم چین کو تو ان کے زعماء اور دانشور بر ملا طور پر اپنے دورِ جلاوطنی یعنی ”DIASPORA“ کا ”عہدِ زیریں“ قرار دیتے ہیں) اسی طرح موجودہ ابراہیمی امت یعنی امتِ مسلمہ پر بھی گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے مسلسل عذابِ الہی کے کوڑے عیسائیوں کے ہاتھوں پڑ رہے ہیں چنانچہ اولاً گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران صلیبوں نے شام، فلسطین اور مصر کے

ساحلی علاقوں کو تاخت و تاراج کیا اور لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا، چنانچہ ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس میں مسلمانوں کا قتل عام تو تاریخ انسانی کے بدترین واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ پھر تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں صدی کے دوران عیسائیوں نے مدربجگہ ہسپانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کو ختم کیا تاکہ سولہویں صدی کے اوائل میں پورے جزیرہ نمائے آئی ہیرا سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ گیا اور یورپ کے جنوب مغربی علاقے سے ”نسلِ صفائی“ (Ethnic Cleansing) کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا (جو اب پانچ سو برس بعد یورپ کے جنوب مشرقی کنارے یعنی بلقان کے علاقے میں ہو رہا ہے) بعد ازاں یورپ کی عیسائی اقوام کا سیلاب واسکوڈی گاما کے دریافت کردہ بحری راستے کے ذریعے مشرقِ اقصیٰ کے مسلمان ممالک پر ٹوٹ پڑا۔ اور سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران جاوا، ملایا، سماٹرا اور ہندوستان سے مسلمان حکومتوں کو ختم کرتے ہوئے بالآخر یہ سیلاب بیسویں صدی کے اوائل میں عظیم سلطنتِ عثمانیہ کو بھی بہا کر لے گیا اور پورا شرقِ اوسط اور شمالی افریقہ بھی عیسائی اقوام کے زیرِ نگیں آ گیا۔ بقول علامہ اقبال۔

لے گئے تھیٹ کے فرزند میراثِ خلیل

خستِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

الغرض، یہودیوں کے لئے سولہ سو برس تک اور مسلمانوں کے لئے ایک ہزار برس سے عیسائیوں نے عذاب کے کوڑے کا کردار ادا کیا ہے اور جیسے کہ سطورِ گزشتہ میں واضح کر دیا گیا تھا، اگرچہ بیسویں صدی عیسوی کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین تعلقات کی نوعیت میں تو ایک انقلابِ عظیم رونما ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں اب مسیحی دنیا بالخصوص ”واسپ“ (WASP) یعنی ”White Anglo Saxon Protestants“ یہودیوں کے بظاہر معاون و محافظ اور مددگار اور سربست اور باطنِ صر ”فرنگ کی رگِ جاں پنجرہ“ یہود میں ہے! کے مطابق زیرِ نگیں اور حاشیہ بردار بن چکے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں ان کا سابقہ کردار پوری طرح برقرار ہے اور ”ترسم کہ دیگر خیزد“ کے مصداق اندیشہ ہے کہ مغربِ مغرب کی عیسائی اقوام کی ایک عظیم یلغار ”حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ

يَا جُوجُ وَ مَا جُوجُ کی سی شان کے ساتھ عالم اسلام بالخصوص شرقی اوسط پر ہونے والی ہے، جس کی صریح پیشین گوئیاں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہیں اور جس کی ایک ادنیٰ جھلک دنیا نے خلیج کی جنگ کے دوران دیکھ بھی لی ہے۔ اور جس کے آئندہ بھیانک تر مرحلے کا جواز فراہم کرنے کے لئے ”مسلم فزائٹلزم“ کا ہوا کھڑا کیا جا رہا ہے، جس کے ضمن میں حال ہی میں ”شہد شاہد مِّنْ اٰهْلِهَآ“ کے مصداق امر کی پروفیسر ڈاکٹر ایکمپوزیٹ نے اپنی حالیہ تالیف میں یہ ”سچی بات“ غالباً کسی ”مستی“ کے عالم میں کہہ دی ہے کہ ”مغرب یا عالم عیسائیت کو اسلام کی جانب سے کسی خطرے یا اندیشے کا واسطہ بالکل بے جا اور غیر واقعی ہے“ اس لئے کہ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک عیسائی دنیا کو کبھی کوئی گزند اسلام کی جانب سے نہیں پہنچا، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے برعکس ہمیشہ عالم اسلام ہی کو عیسائی دنیا کی جانب سے نقصان پہنچتا رہا ہے۔“

لیکن اس سے قبل کہ ہم ”آنے والے دور کی“ صرف ”دھندلی سی راک تصویر“ نہیں بلکہ وہ واضح تصویر دیکھیں جو احادیث میں موجود ہے، آئیے کہ پہلے موجودہ دنیا میں مذاہب کے اعتبار سے ”انسانی جغرافیہ“ پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں اور پھر ابراہیمی مذاہب خصوصاً عیسائیت کا ایک مختصر سا جائزہ لے لیں۔

اس وقت دنیا کی کل انسانی آبادی ساڑھے پانچ یا پونے چھ ارب کے لگ بھگ ہے (ماہرین کا اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء میں یہ آبادی چھ ارب تیس کروڑ ہو جائے گی) اس میں سے نصف سے زائد آبادی تین ابراہیمی مذاہب کی پیروکار ہے، چنانچہ شکاگو کی عیسائیوں اور یودیوں کی مشترکہ ”میشل کانفرنس“ نے ۱۹۹۰ء میں جو ”انٹرنیٹہ کیلنڈر“ شائع کیا تھا اس کے مطابق اب سے تین سال قبل دنیا میں یودیوں کی کل آبادی ڈیڑھ کروڑ سے بھی کم، مسلمانوں کی ایک ارب سے زائد اور عیسائیوں کی پونے دو ارب کے لگ بھگ (ایٹلی کن چرچ سات کروڑ، کیتھولک نوے کروڑ، آرٹھوڈوکس تیرہ کروڑ اور پروٹسٹنٹ

۱۔ سورۃ الانبیاء آیت ۹۹

۲۔ سورۃ یوسف آیت ۲۶

تریٹھ کروڑ تھی۔ اس میں اگر ان دو عوامل کا اضافہ کر لیا جائے کہ اولاً یہودیوں اور عیسائیوں میں تو آبادی کا اضافہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے جبکہ مسلمانوں کے بارے میں مسلم ہے کہ ان کی آبادی میں شرح اضافہ بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ثانیاً مسلم اقلیت والے ممالک (بالخصوص بھارت) میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم دکھائی جاتی ہے، تو محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں ایک ارب تیس کروڑ (بعض لوگوں کے خیال میں پونے دو ارب) مسلمان موجود ہیں (واللہ اعلم)۔ مذکورہ بالا کیلنڈر کے مطابق ۱۹۹۰ء میں دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں سب سے بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی یعنی پینسٹھ کروڑ سے زائد، پھر بدھ مت کے پیروکار تھے یعنی پچیس کروڑ کے لگ بھگ، پھر سکھ تھے یعنی تقریباً پونے دو کروڑ، اور باقی صرف لاکھوں میں۔ ان میں بھی تین سال کے عرصے کے دوران کا اضافہ شامل کر لیا جائے اور پھر اس میں ایک ارب کے قریب لاندہب یا نیچر و ریشپ والے لوگوں کو جمع کر لیا جائے تو کل حاصل جمع وہی بن جاتا ہے جو اوپر دیا گیا۔

قرآن حکیم پر ایمان اور قرآن کے فلسفہ تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے لیکر اس دم تک دین برحق اسلام ہی رہا ہے۔ اور دنیا کے باقی جملہ مذاہب آسمانی ہدایت اور انبیاء اور رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی کی محرف اور تبدیل شدہ صورتیں ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر کی صورتیں اتنی بدل چکی ہیں کہ اب بقول جگر مراد آبادیؒ ”کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!“ البتہ صرف دو مذاہب وہ ہیں جن کا اصل ”اسلام“ کے ساتھ تعلق اور تسلسل کم از کم تاریخی اعتبار سے ثابت ہے یعنی یہودیت اور نصرانیت۔ اور جیسے کہ اس سے قبل تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے، ان میں سے بھی اصل مسلمان امتیں دو ہی ہیں، یعنی سابقہ امت مسلمہ بنی اسرائیل اور موجودہ امت مسلمہ یا مسلمان۔ اور آئندہ اصل اور فیصلہ کن معرکہ تو ان ہی کے مابین ہو گا لیکن مستقبل قریب میں ابتداء نمایاں کردار ادا کریں گے ابراہیمی مذاہب کے ”تین میں کے تیسرے“ مذاہب کے پیروکار یعنی عیسائی۔ لہذا ان کے بارے میں قرآنی نقطہ نظر کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔

موجودہ عیسائی مذہب اگرچہ ان چار بڑے بڑے فرقوں میں منقسم ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے (بلکہ ان کی مزید تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس وقت بائیس ہزار سے زائد ”چرچ“ وجود میں آچکے ہیں) تاہم ان سب کے مابین تثلیث، صلیب اور کفارہ کے عقائد متفق علیہ ہیں۔ قرآن حکیم تثلیث کی توشیح کے ساتھ نفی کرتا ہے، اس خیال کی بھی پر زور تردید کرتا ہے کہ حضرت مسیحؑ سولی پر چڑھائے گئے جہاں ان کی موت واقع ہوئی، جس سے کفارے کا عقیدہ بھی خود بخود منہدم ہو جاتا ہے۔ الحمد للہ کہ اگرچہ صلیب کا واقعہ تو اناجیل اربعہ میں موجود ہے، لیکن تثلیث یا ایسی مسیح کے عقیدے کی کوئی بنیاد ان میں ہرگز موجود نہیں اور ان کا اولین سرخ تو اگرچہ سینٹ پال کی تحریروں میں مل جاتا ہے تاہم انہیں باضابطہ اور سرکاری طور پر طے شدہ عقائد کی حیثیت بہت بحث و تحیص اور جدل و نزاع کے نتیجے میں حضرت مسیحؑ کے لگ بھگ تین سو برس بعد حاصل ہوئی اور اس عرصے کے دوران موحّدین اور تثلیث کے قائلین کے مابین شدید خون خرابہ بھی ہوا۔ جہاں تک حضرت مسیحؑ کی ذات اور شخصیت کا تعلق ہے چند امور تو وہ ہیں جو ایک جانب قرآن حکیم اور احادیث نبویہ اور دوسری جانب اناجیل اربعہ کے مابین مشترک ہیں، لہذا مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین متفق علیہ عقائد کی حیثیت رکھتے ہیں، جبکہ بعض امور ایسے ہیں جن میں قرآن اور اناجیل تو متفق ہیں لیکن سینٹ پال کی تراجم کے باعث عیسائیت ان کی قائل نہیں اور بعض امور ایسے بھی ہیں جو قرآن اور اناجیل کے مابین بھی مختلف فیہ ہیں۔ چنانچہ متفق علیہ امور تو یہ ہیں کہ:

(۱) حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش معجزانہ طور پر بن باپ کے ہوئی لیکن چونکہ ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم صدیقہ رضی اللہ عنہا اسرائیلی تھیں، لہذا حضرت مسیحؑ کا تعلق بھی بنی اسرائیل سے ہے۔

(۲) ان کے دست مبارک سے ایسے عظیم معجزے صادر ہوئے جن کی نہ کوئی دوسری مثال موجود ہے نہ ہی ان سے بڑے حسی معجزوں کا تصور ممکن ہی ہے۔ جیسے مُردوں کو

زندہ کر دینا، گارے سے پرندے کی صورت بنانا اور پھر اس میں پھونک مار کر اسے زندہ اور اڑتا ہوا پرندہ بنانا وغیرہ۔ (واضح رہے کہ قرآن حکیم معنوی اور ابدی معجزہ ہونے کے اعتبار سے ان جملہ معجزات سے افضل ہے لیکن اس کا اعجاز صرف دل کی آنکھ اور عقل کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے، سر کی آنکھ سے نہیں!)

(۳) انہوں نے یہودیوں میں توبہ کی زبردست منادی کی اور انہیں اخلاقی اور روحانی اصلاح کی زوردار دعوت دی اور اس ضمن میں ان کے علماء، مفتیوں، اور قاضیوں اور ان کی ریاکارانہ مذہبیت پر شدید تنقیدیں کیں، چنانچہ مذہب کے یہ اجارہ دار طبقات آنجنابؐ کے شدید دشمن اور جان کے درپے ہو گئے۔

(۴) ان کی زوردار دعوت کا شور اور غلغلہ تو بہت بلند ہوا، اور یروشلیم اور آس پاس کے علاقے کے یہودی عوام اس سے متاثر بھی بہت ہوئے لیکن ان پر ایمان بہت ہی کم لوگ لائے اور ان میں سے بھی صرف چند حواری ایسے تھے جو ان کے دن رات کے ساتھی اور دل و جان سے فدا لائی تھے۔ (اناجیل کی رو سے ان کی تعداد بارہ تھی، اگرچہ مختلف اناجیل میں ناموں کا اختلاف ہے)

(۵) بالآخر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھایا اور قیامت کے قریب وہ دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے۔

یہ بات بڑی اہمیت کی حامل، اور نہایت توجہ کے قابل ہے کہ دنیا کی کل آبادی کا نصف سے زائد حضرت عیسیٰؑ کی ذاتِ مبارکہ کے بارے میں ان پانچ امور پر متفق ہے جن میں سے بعض باتیں نہایت غیر معمولی اور خالص خرقِ عادت یعنی دنیا کے پام طبعی قوانین کے بالکل برعکس ہیں!

اب آئیے ان دو نہایت اہم اور اساسی امور کی جانب جن پر قرآن و حدیث اور اناجیل اربعہ تو متفق ہیں لیکن سینٹ پال کی اختیار کردہ ترمیمی آراء اور اقدامات کی بناء پر موجودہ غیساہیت کا موقف اور طرز عمل ان سے مختلف ہی نہیں متضاد ہے۔ وہ دو امور حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت مسیحؑ نہ کوئی نئی شریعت لائے تھے، نہ ہی انہوں نے شریعت موسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو منسوخ کیا بلکہ وہ حضرت موسیٰؑ ہی کی لائی ہوئی شریعت کی تجدید و توثیق اور بنی اسرائیل کی اخلاقی و روحانی اصلاح، اور دین کی حقیقی روح کے احیاء کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ گویا وہ اپنی ذات کی حد تک سابقہ امت مسلمہ ہی سے تعلق رکھتے تھے اور کسی نئے دین و مذہب یا ملت و امت کے بانی نہیں تھے۔ چنانچہ مشہور زمانہ تالیف "The 100" کے مؤلف ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ جب تک حضرت مسیحؑ دنیا میں موجود رہے، آپؑ اور آپؑ کے ساتھیوںؑ کی حیثیت یہودی ہی کی ایک جماعت یا زیادہ سے زیادہ فرقے کے علاوہ کچھ نہ تھی! گویا موجودہ مسیحیت کے اصل بانی حضرت مسیحؑ نہیں، سینٹ پال ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ شریعت موسویؑ کو عیسائیوں کے لئے منسوخ قرار دیا بلکہ خود شریعت ہی کی کھلی نفی کر دی اور اسے "معاذ اللہ" "لعنت" قرار دیا۔

(۲) حضرت مسیحؑ کی دعوت صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی۔ چنانچہ آنجنابؑ نے خود اپنی دعوت اور خطاب کو بھی صرف بنی اسرائیل تک محدود رکھا اور صاف فرمایا: "میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں!" اور اپنے شاگردوں کو بھی سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ اپنی دعوت و تبلیغ کے دائرے کو بنی اسرائیل کے باہر وسعت نہ دیں۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی "انقلابی قدم" سینٹ پال ہی نے اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی صدی عیسوی کی چالیس کی دہائی کے دوران اس معاملے میں حضرت مسیحؑ کے ماننے والوں کے محدود حلقے میں شدید بحث و نزاع کا بازار گرم رہا۔ لیکن بالآخر فتح سینٹ پال اور ان کے حامیوں ہی کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد عیسائیت کو اصل فروغ غیر اسرائیلی اقوام ہی میں ہوا۔ اور آج عیسائیوں میں نسلی طور پر بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا تناسب آنے میں نمک کی مقدار سے بھی بہت کم ہے! آخر میں اس واحد اہم اور اساسی امر پر بھی نگاہ ڈال لیں جس کے معاملے میں ایک جانب قرآن و حدیث اور دوسری جانب اناجیل اربعہ میں واضح اختلاف بلکہ کھلا تضاد ہے

..... یعنی یہ کہ اناجیل اربعہ کے مطابق یہودی علماء کے فتوے اور ان کی مذہبی عدالت کے فیصلے کے مطابق بلکہ ان کے اصرار پر رومی حاکم پیلاطس پوٹس نے حضرت مسیحؑ کو سولی پر چڑھادیا جہاں ان کی موت واقع ہو گئی، اگرچہ بعد میں جبکہ ان کا جسدِ خاکی ایک غار میں رکھا ہوا تھا وہ زندہ ہو گئے اور اپنے بعض شاگردوں کو اپنی واپسی اور دوبارہ دنیا میں آنے کی نوید سن کر آسمان پر چلے گئے۔ جبکہ قرآن حکیم ان کے مصلوب یا قتل ہونے کی شدت سے نفی کرتا ہے اور صحیح اور مستند ترین احادیث صراحت کرتی ہیں کہ آنجنابؑ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے اور قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے اور اس کے بعد ہی آپؑ پر طبعی موت کا مرحلہ آئے گا۔ تاہم قرآن اور حدیث دونوں میں یہ تفصیل موجود نہیں ہے کہ آنجنابؑ کا رفعِ سماوی کب، کہاں اور کس مرحلے پر ہوا اور آپؑ کی جگہ کون مصلوب ہوا۔ البتہ یہ ظاہر تمام و کمال انجیل برنباس کے ذریعے پُر ہو جاتا ہے۔ یعنی عین اُس وقت جب حضرت مسیحؑ کے ایک غدار حواری یہوداہ اسکریوتی کی بخبری پر رومی سپاہی آنجنابؑ کی گرفتاری کے لئے اس باغ میں داخل ہوئے جہاں آپؑ روپوش تھے، اللہ کے حکم سے چار فرشتے نازل ہوئے جو آنجنابؑ کو اٹھا کر لے گئے اور اس غدار حواری کی صورت آپؑ کے مشابہ بنا دی گئی۔ چنانچہ وہی گرفتار ہوا اور بالآخر مصلوب ہو کر کفرِ کردار کو پہنچ گیا۔ (واضح رہے کہ عیسائی یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ سینٹ برنباس حضرت مسیحؑ کے اولین مبلغین میں سے تھے، یہاں تک کہ ابتداء میں خود سینٹ پال کی حیثیت ان کے نائب کی تھی، لیکن متذکرہ بالا انجیل کی نسبت ان کی جانب درست نہیں سمجھتے، بلکہ اسے جعلی اور فرضی قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آپؑ کے اسمِ گرامی کی صراحت کے ساتھ بکثرت موجود ہے لہذا عیسائی اسے کسی مسلمان کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس خیال کی تردید کے لئے صرف یہ ”قرآن کی شہادت“ کفایت کرتی ہے کہ اگر واقعتاً ایسا ہوتا تو اس انجیل کا تذکرہ مسلمانوں کے لڑیچر میں ہونا لازمی تھا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا حوالہ پورے مسلم لڑیچر میں کہیں موجود نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کی جملہ تفاسیر حضرت مسیحؑ کے رفعِ سماوی کے وقت اور مقام کی

تفصیل اور اس سوال کے جواب سے خالی ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی جگہ کون شخص مصلوب ہوا۔ اس لئے کہ قرآن حکیم حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہونے کی تو شدت کے ساتھ نفی کرتا ہے لیکن واقعہ صلیب کی مطلق نفی نہیں کرتا۔

حاصل کلام یہ کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور تورات اور عہد نامہ قدیم کی دیگر کتابوں کی بائبل میں شمولیت کی بنا پر عیسائیت ابتداء میں یقیناً ابراہیمی مذاہب ہی کے سلسلے کی کڑی تھی، لیکن چونکہ زیادہ سے زیادہ تین سو سال بعد اس کی کامل قلبی ماہیت ہو گئی تھی چنانچہ موجودہ عیسائیت اپنے عقائد یعنی تثلیث، صلیب، اور کفارہ کے حوالے سے، اور شریعت موسوی سے انقطاع کے باعث ایک بالکل علیحدہ مذہب کی صورت اختیار کر چکی ہے جو آسمانی مذاہب کے مقابلے میں فلسفیانہ مذاہب سے قریب تر ہے، لہذا اب اس کی یقینہ دونوں ابراہیمی مذاہب سے کوئی مناسبت باقی نہیں رہی۔ لیکن چونکہ ”آنے والے دور“ میں حضرت مسیحؑ کا نزول یا آپؐ کی آمدِ عالمی بجائے خود بھی نہایت اہم واقعہ ہو گا اور اس پر مستزاد اہم ترین عالمی تبدیلیوں کی تمہید بنے گا (اگرچہ آنجنابؐ کے نزول یا آمدِ عالمی کا مقصد اناجیل سے واضح نہیں ہوتا بلکہ صرف نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ کے ذریعے سامنے آتا ہے اور وہ قرآن کے اس قانونِ عذاب کے عین مطابق ہے جس پر اس سے قبل گفتگو ہو چکی ہے، تاہم اس پر مفصل کلام بعد میں ہو گا) مزید برآں، چونکہ اس سے بھی پہلے ایک جھوٹا مکار اور دجال شخص حضرت مسیحؑ ہی کے نام پر دنیا میں عظیم فساد برپا کرے گا، جس کی واضح پیشینگوئیاں احادیثِ نبویہؐ میں بھی موجود ہیں اور عہد نامہ جدید میں بھی، لہذا ضروری ہے کہ، اناجیل اربعہ کے ساتھ تقابل سے قطع نظر، مثبت طور پر قرآن اور حدیث کے حوالے سے حضرت مسیحؑ کی شخصیت پر مزید روشنی ڈال دی جائے۔ (واضح رہے کہ متذکرہ بالا جھوٹے اور مکار شخص کو احادیثِ نبویہؐ میں ”المسیح الدجال“ کا نام دیا گیا ہے، اور عیسائی دنیا اسے ”Anti-Christ“ کے نام سے جانتی ہے۔ اور آج کل سولہویں صدی عیسوی کے ایک فرانسیسی نژاد، یہودی انسل عیسائی درویش ”ماسٹرے ڈیس“ کی پیشینگوئیوں پر مبنی ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے

اس کا بہت چرچا مغربی دنیا میں ہو رہا ہے۔ اور اگرچہ عیسائی دنیا کی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ قدیمی اور روایتی دشمنی کی بناء پر یہ پروپیگنڈا شدہ و مد کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ یہ ایٹمی کرائسٹ عرب مسلمانوں میں سے ہو گا تاہم اس سے قطع نظر کہ وہ کس قوم سے ہو گا یہ امر اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کہ یہ تصور بھی عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے (بہر حال، حضرت مسیحؑ کے بارے میں قرآن حکیم اور احادیث رسولؐ کی بنیاد پر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آنجناب اللہ کے محبوب بندے، برگزیدہ نبی اور جلیل القدر رسول تھے۔ بحیثیت نبی آپؐ سلسلہ انبیاء بنی اسرائیل کی آخری کڑی تھے اور بحیثیت رسول آپؐ مکی بعثت بھی صرف بنی اسرائیل ہی کی جانب تھی۔ آپؐ مکی بعثت کا مقصد دین موسویؑ ہی کی تجدید و توثیق اور اس میں پیدا کردہ تحریفات کا ازالہ اور یہودیوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح تھا۔ مزید برآں، آپؐ ایک جانب ان پیشنگویوں کے مصدق و مصداق بن کر آئے تھے جو انبیاء بنی اسرائیلؑ کے ایک نجات دہندہ کے ظہور کے بارے میں کرتے آئے تھے، اور دوسری جانب آپؐ خاتم النبیین اور آخر المرسلین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث اور منادی کرنے والے بن کر آئے تھے، آپؐ کی ولادت چونکہ بن باپ کے ہوئی تھی اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنی جانب سے ایک خاص روح اور اپنا ایک خصوصی کلمہ قرار دیا جو آپؐ کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کی جانب القاء کیا گیا، ولادت کے فوراً بعد آپؐ سے یہ عظیم معجزہ بھی ظاہر ہوا کہ آپؐ نے ہتھکڑے میں سے بول کر اپنی والدہ ماجدہ کی پاکدامنی کی بھی گواہی دی اور اپنی نبوت و رسالت کا بھی اعلان کیا۔ پھر جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے آپؐ کو عظیم ترین حسی معجزات عطا کئے گئے۔ گویا کہ بنی اسرائیل پر آپؐ کے ذریعے آخری درجہ میں اتمام حجت کر دیا گیا۔ لیکن اس سب کے باوجود یہودی اکثریت بالخصوص ان کے علماء نے آپؐ

۱۔ سورۃ الصف آیت ۶

۲۔ سورۃ النساء آیت ۱۷۱

۳۔ سورۃ مریم آیات ۲۹ تا ۳۱

کی تصدیق نہیں کی بلکہ آپؐ کی والدہ ماجدہ پر بدکاری کی تہمت لگا کر آپؐ کو (معاذ اللہ) ولد الزنا بھی قرار دیا اور جادوگر اور کافرو مرتد قرار دے کر واجب القتل بھی ٹھہرایا۔ اور اپنے بس پڑتے تو آپؐ کو سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ”وہ نہ آپؐ کو قتل کر سکے نہ صلیب دے سکے“ بلکہ اللہ نے آپؐ کا معاملہ ان کے لئے مشتبہ بنا دیا..... اور انہوں نے آپؐ کو ہرگز قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے آپؐ کو اپنی جانب اٹھالیا!“ مزید برآں، قرآن نے بھی آپؐ کو ”عَلَّمْ لِّلسَّاعَةِ“ (قیامت کی ایک نشانی) قرار دیا ہے اور احادیثِ نبویہؐ میں تو یہ بات تواتر اور غایت درجہ صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ آپؐ قیامت سے قبل نازل ہوں گے اور جھوٹے اور فریبی مسیح یعنی ”المسیح الدجال“ کو بہ نفس نفیس خود قتل کریں گے۔

”آنے والے دور“ کی ایک دھندلی نہیں واضح تصویر پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کو بھی تاریخی حقائق کے پس منظر میں سمجھ لیا جائے کہ یہ انقلابِ عظیم کیسے رونما ہوا کہ وہ یہودی جو ایک ہزار برس تک عیسائیوں کے نزدیک اربذلِ خلاق اور مبغوض ترین لوگ رہے اور ان کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتے رہے رفتہ رفتہ اس پوزیشن میں آگئے کہ اس صدی کے اوائل میں نابغہٴ عصر اور ”برہمن زادہٴ رمز آشنائے روم و حمیر“ علامہ اقبال نے اپنے انگلستان اور جرمنی کے مختصر سے قیام کے دوران وہ حقیقت پنچشمِ دل دیکھ لی تھی جو آج پوری دنیا پنچشمِ سردیکھ رہی ہے، یعنی ”فرنگ کی رگِ جاں پتھرِ یہود میں ہے!“

اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ میں واضح کیا ہے کہ ”ہم نے ان کے (یعنی یہود اور نصاریٰ کے) مابین قیامت کے دن تک کے لئے بغض اور عداوت پیدا کر دی ہے!“ قرآن حکیم پر یقین رکھنے والا ہر سنجیدہ طالبِ علم اس سے یہ دو نتائج لازماً اخذ کرے گا کہ اولاً.....

یہودیوں اور عیسائیوں کا موجودہ ”گٹھ جوڑ“ محض ظاہری اور سطحی ہے اور ثانیا: اب دنیا کا خاتمہ اور ”اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ“ کا مرحلہ زیادہ دور نہیں ہے، لیکن سرِ دست ان حقائق سے صرف نظر کرتے ہوئے نگاہوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے تعلقات کے تین ادوار پر مرکوز کر دیجئے جن کا مختصر بیان حسب ذیل ہے:

(۱) پہلا دور عیسوی تقویم کی پہلی تین صدیوں پر محیط ہے جن کے دور ان پیروانِ مسیح کی تعداد قلیل تھی (اور ان میں معتد بہ تعداد حضرت عیسیٰؑ کے اصل موحد پیروکاروں کی بھی شامل تھی) چنانچہ ان پر دو جانب سے تشدد ہو رہا تھا یعنی ایک یہودیوں کی طرف سے اور دوسرے بت پرست رومیوں کی جانب سے!

(۲) اس صورت حال میں انقلاب چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں آگیا جب سلطنتِ روم نے عیسائیت قبول کر لی۔ لہذا اب معاملہ برعکس ہو گیا اور یہودیوں پر عرصہٴ حیات تنگ ہو گیا اور انہیں بدترین تشدد اور تعذیب کا نشانہ بننا پڑا۔ اس لئے کہ وہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیحؑ کے قاتل تھے جن کی ذاتِ اقدس کے ساتھ ان کی محبت اور عقیدت کا ”غلو“ اس درجہ شدید تھا کہ انہیں الوہیت میں شریک کر دیا تھا۔ یہ دور کم و بیش ایک ہزار سال تک جاری رہا۔

(۳) اس صورت حال میں جو انقلاب تدریجاً برپا ہوا جس کے نتیجے میں بالآخر یہودیوں اور عیسائیوں کا وہ ”گٹھ جوڑ“ پیدا ہوا جس کی پیشگی خبر قرآن حکیم نے ”بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ“ کے الفاظ میں دے دی تھی، وہ یہودی سیاست اور ذہانت کا شاہکار ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کے لئے انہوں نے مسلمانوں کو آلہ کار بنایا۔ چنانچہ پہلے انہوں نے آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہسپانیہ کی فتح میں مسلمانوں کی مدد کی اس لئے کہ ہسپانیہ کے عیسائی ان کے بدترین دشمن تھے اور انہیں توہین و تذلیل ہی نہیں تشدد و تعذیب کا نشانہ بن رہے تھے اور دنیا کا مسلم اصول ہے کہ کسی کے دشمن کا دشمن اس کا دوست بن جاتا

لہ سورۃ النساء آیت ۱۷۱

لہ سورۃ النساء آیت ۵۵

”آنے والے دور کی ایک واضح تصویر“

علامہ اقبال نبوت تو درکنار ولایت تک کے مدعی نہیں تھے (ع) ”میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہ!“ گویا وہ صرف ایک نابغہ انسان تھے۔ اس کے باوجود ایک جانب ع ”گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود!“ کے مصداق ان کی ژرف نگاہی اور حقیقت بینی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے تقریباً پون صدی قبل اس حقیقت کا مشاہدہ کہ ع ”فرنگ کی رگ جال پنجہ یود میں ہے!“ پچشم قلب کر لیا تھا جو آج پوری دنیا کو پچشم سر نظر آ رہی ہے۔ اور دوسری جانب وہ ایک وژنری بھی تھے اور اپنے مستقبل کے وژن پر انہیں جو اعتماد اور یقین حاصل تھا وہ ان کے ان اشعار سے عیاں ہے کہ

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ افکار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!

اور

پردہ اٹھا دوں اگر چہرہ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!

مزید برآں اپنی اس مستقبل اندیشی اور ”عاقبت بینی“ میں انہیں جس قدر جذب اور اشتہاک حاصل تھا وہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے ہسپانیہ میں دریائے وادی الکبیر کے کنارے واقع جامع قرطبہ میں کہا تھا۔ یعنی۔

آپ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!

اور ان کی اس ”دور بینی“ نے انہیں ”آنے والے دور“ کے جو منظر دکھائے اس پر خود اپنی حیرت اور استعجاب کا اظہار انہوں نے یوں کیا کہ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

تو جب ایک غیر نبی نابغہ انسان کا عالم یہ ہے تو اس پر قیاس کرتے ہوئے غور کیجئے کہ انبیاء ارام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ ”مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ کے جو مشاہدات کراتا رہا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ”مَا أَرَاكَ اللَّهُ“ اور ”أَرَيْتَا كَيْفَ“ کا جو معاملہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ رہا اس کی بناء پر جو پیشنگویاں آپ نے مستقبل کے حوادث و واقعات کے ضمن میں کی ہیں ان کے حتمی اور قطعی ہونے میں کسی شک کا کوئی امکان کسی مدعی ایمان کے لئے کیسے ممکن ہے؟ لیکن افسوس کہ عہدِ حاضر میں مادیت اور مادہ پرستی کی جو ہوائیں چلیں اور ان کے باعث جو نظریاتی اور اعتقادی فتنے خود مسلمانوں میں پروان چڑھے ان کے زیر اثر جدید تعلیم یافتہ نسل کا ایک معتد بہ حصہ ان پیشنگویوں کو توجہ اور اعتناء کے لائق نہیں سمجھتا اور اس ”مفتونیت“ کی شدت کا عالم یہ ہے کہ اب بھی جبکہ وہ حوادث و واقعات جن کی خبر دی گئی تھی نوشتہ دیوار کے مانند نگاہوں کے سامنے آچکے ہیں ان کو تسلیم کرنے سے اعراض ہی کی روش پر اصرار کیا جا رہا ہے۔

مستقبل میں پیش آنے والے واقعات میں سے سب سے یقینی اور قطعی معاملہ تو اس دنیا کے خاتمے یعنی قیامِ قیامت کا ہے جسے قرآن حکیم السَّاعَةِ ”الْوَاقِعَةُ“ القَارِعَةُ اور الحَاقَةُ ایسے ناموں سے موسوم کرتا ہے اور جس کا کسی نہ کسی انداز میں ذکر قرآن مجید کے ہر صفحے پر موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تصدیق تو اسلام اور ایمان کے بنیادی لوازم میں شامل ہے۔ تاہم اب سے تقریباً سو برس قبل جو نئی ”سائنٹیفک عقلیت“ عالم

۱۔ سورۃ الانعام، آیت ۷۵

۲۔ سورۃ النساء، آیت ۱۰۵

۳۔ سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۶۰

اسلام پر حملہ آور ہوئی تھی جس کی اساس نیوٹن کی فزکس پر تھی اس نے قیام قیامت کو بھی مبہوم اور مشکوک بنادیا تھا۔ اس لئے کہ اُس دور کی فزکس کے مطابق مادہ حقیقی بھی تھا اور دائمی و غیر فانی بھی۔ چنانچہ یہ تصور عام تھا کہ کائنات ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ تو بھلا ہو آئن سٹائن اور اس کے بعد کے علماء طبیعیات کا جن کے انقلاب آفریں انکشافات کے نتیجے میں مادہ بھی تحلیل ہو کر صرف انرجی کی صورت اختیار کر گیا اور کائنات کے بارے میں بھی یہ حقائق تسلیم کر لئے گئے کہ یہ ایک خاص لمحے میں ایک ”عظیم دھماکے“ (Big Bang) کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی (جو گویا اللہ تعالیٰ کے امر ”کن“ کی تعبیر ہے) اور ایک پھلجھڑی کے مانند چکر لگاتی ہوئی مسلسل گھل اور پھیل رہی ہے۔ اور ایک خاص مدت کے بعد واپس برعکس سمت میں چکر لگاتی ہوئی تنگ ہوتے ہوتے بالآخر ایک نقطہ کی صورت اختیار کر لے گی جیسے کہ متعدد کھشائیں پہلے ہی ”سیاہ سوراخوں“ (Black Holes) کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ چنانچہ چند ہی سال قبل ایک پاکستانی ماہر طبیعیات چوہدری بشیر الدین نے ایک کتاب بھی طبیعیات قیامت کے موضوع پر ”Mechanics of the Domsday“ کے نام سے تصنیف کر دی ہے جس میں واضح کر دیا ہے کہ پوری کائنات کی بڑی اور آخری قیامت سے قبل جو ہو سکتا ہے کہ ابھی کافی دور ہو اس کے جس حصے میں ہماری زمین واقع ہوئی ہے اس کی چھوٹی اور محدود قیامت واقع ہو سکتی ہے اور کوئی عجب نہیں کہ وہ قریب ہی ہو۔ (جگر مراد آبادی نے تو نہ معلوم کس کیفیت میں یہ شعر کہا تھا:۔ ”اربابِ اہم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے میری۔۔۔ دُنیا سے قیامت دُور سہی، دُنیا کی قیامت دُور نہیں!“ لیکن اس میں ہو سکتا ہے کہ کچھ ”توارد“ متذکرہ بالا نظریے کے ساتھ بھی ہو گیا ہو۔)

بہر حال ایمان کے نقطہ نظر سے تو اصل اہمیت قیامت کے قُرب یا بُعد اور اس کی ”میکنکس“ اور جزوی یا کُلّی ہونے کی نہیں اس کے ”یقینی“ ہونے کی ہے اور انسان کی فوز و فلاح کے نقطہ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہمیت کا معاملہ ”بعث بعد الموت“ یعنی

موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور جزا و سزا پر یقین کا ہے۔ اسی طرح ہماری اس وقت کی بحث اور گفتگو کے اعتبار سے اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قیامت کی جو علامات بتائی ہیں ان کے اعتبار سے اب یہ معاملہ زیادہ دیر اور دور کا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو آپ ﷺ نے خود اپنی بعثت کو قرب قیامت کی علامت قرار دیا اس لئے کہ آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ ﷺ کے بعد اب کسی نبی یا رسول کو نہیں قیامت ہی کو آتا ہے۔ چنانچہ بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا: ”میری بعثت اور قیامت آپس میں ایسے ملی ہوئی ہیں جیسے یہ دونوں انگلیاں!“ اور اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں آپ ﷺ نے یہی بات ان الفاظ میں فرمائی جو ترمذیؒ نے مستور ابن شدادؓ سے روایت کئے ہیں: ”یعنی: ”میں تو گویا عین قیامت ہی میں مبعوث کیا گیا ہوں اور میں نے اس سے صرف اتنی ہی سبقت کی ہے جتنی درمیانی انگلی انگشت شہادت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے“۔۔۔۔۔ اور سیرست ان خالص معجزانہ اور خرق عادت واقعات سے قطع نظر جو عین وقوع قیامت سے متعلق قبل پیش آئیں گے، قرب قیامت کی بعض اہم علامات کا تعلق صحرائے عرب اور اس کے باد یہ نشینوں کی اس حیرت ناک خوشحالی سے ہے جو آج سے سو سال قبل کسی کے وہم و گمان میں بھی آنی ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ (۱) اس ”حدیث جبرائیل“ میں جو ”اُمُّ السُّنَدِ“ یعنی حدیث رسول ﷺ کے ذخیرے میں اسی مقام و مرتبے کی حامل قرار دی جاتی ہے جو قرآن حکیم میں سورۃ الفاتحہ کا ہے، اور جو صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ کے علاوہ جملہ کتب حدیث میں متعدد جلیل القدر صحابہؓ سے مروی ہے، قرب قیامت کی ایک اہم علامت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ: ”تم دیکھو کہ وہ مفلوک الحال چرواہے جو کبھی ننگے پیر اور ننگے بدن ہوا کرتے تھے عالی شان عمارتوں کی بلندی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں!“ (۲) امام مسلمؒ نے جو حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے اس میں قرب قیامت کی علامت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ: ”دولت اتنی کثیر

اور عام ہو جائے گی کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ نکالے گا لیکن اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا (سعودی عرب، کویت اور متحدہ امارات کے مقامی باشندوں کی حد تک یہ صورت حال فی الواقع پیدا ہو چکی ہے) اور عرب کی زمین سبزہ زاروں اور چشموں کا منظر پیش کرنے لگے گی! اور (۳) سب سے بڑھ کر وہ حدیث جو امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت کی ہے، جس کی رو سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد نہ ہو جائے جس پر لوگ ایک دوسرے سے جنگ کریں گے یہاں تک کہ ننانوے فیصد لوگ مارے جائیں گے۔“

ان میں سے جہاں تک پہلی دو حدیثوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ وہ تو خود ہی ”آفتاب آمد دلیل آفتاب“ کی مصداقِ کامل ہیں البتہ تیسری حدیث پر غور کے ضمن میں یہ چند امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں: (۱) قدیم زمانے میں ملکوں کو دریاؤں کے نام سے موسوم کرنے کا رواج تھا۔ چنانچہ یہاں فرات سے مراد عراق اور کویت ہیں۔ (۲) آج کے صنعتی دور میں سب سے زیادہ قیمتی متاع تیل ہے، جسے بجا طور پر ”سیال سونا“ کہا جاتا ہے۔ (۳) کوئی عجب نہیں کہ تیل کے وہ زیر زمین اور زیر سمندر سوتے بھی جن سے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات تیل نکال رہے ہیں وادی فرات ہی کی جانب سے آتے ہوں۔ (۴) اس تیل کی دولت پر جو ”جنگِ عظیم“ شروع ہوئی ہے دو سال قبل کی خلیج کی جنگ کو اس کے صرف نقطہ آغاز کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ یاد ہو گا کہ اسے صدام حسین نے ”اُمّ المَحَارِب“ یعنی جنگوں کی ماں قرار دیا تھا۔ اور (۷) اس چند روزہ ”نقطۂ آغاز“ کے دوران جو ناقابلِ تصور حد تک وحشیانہ بمباری عراق پر ہوئی تھی اس کے پیش نظر کون سے تعجب کی بات ہے کہ اگر جنگوں کا یہ سلسلہ آگے بڑھے تو عراق اور کویت کی تباہی اسی درجہ کی ہو جائے جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے۔ خداوندِ اے چہرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔“

الغرض، راقم کو اگرچہ ان نجومیوں کی پیشینگوئیوں اور ماہرینِ فلکیات کی دی ہوئی

خبروں سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے جو دنیا کے خاتمے کو صرف قریب ہی نہیں قرار دے رہے ہیں بلکہ اس کا وقت بھی معین کر رہے ہیں (اگرچہ ”قرائن کی شناخت“ کے درجے میں وہ بھی قابلِ اعتناء ہیں!) لیکن ان احادیثِ نبویہؐ کی بناء پر جن میں سے چند کا خوالہ اوپر دیا گیا راقم کو یہ یقین حاصل ہے کہ دنیا نہایت تیز رفتاری کے ساتھ (گویا رخ ”دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!“ کے سے انداز میں) اپنے خاتمے کی جانب بڑھ رہی ہے۔ (الطف یہ ہے کہ زمانہ اور وقت اور واقعات و حوادث کی اس تیز رفتاری کا نقشہ بھی ایک حدیث میں نہایت خوبصورت استعاراتی زبان میں کھینچ دیا گیا ہے جسے امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے جس کی رو سے آنحضور ﷺ نے فرمایا: ”قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک زمانہ مختصر نہ ہو جائے“ جس کے نتیجے میں سال مہینے کے برابر نظر آنے لگے، مہینہ جمعہ (تاجمہ یعنی ایک ہفتہ) محسوس ہونے لگے، جمعہ (یعنی ہفتہ) ایک دن کی طرح ہو جائے، دن ایک گھنٹے کے برابر محسوس ہو اور ایک گھنٹہ آگ کے ایک شعلے کی بھڑک کے مانند مختصر ہو جائے!“

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، وقوعِ قیامت تو چونکہ قرآن مجید کا سب سے زیادہ کثیر الذکر موضوع ہے، لہذا اس سے تو کسی مسلمان کو مجالِ انکار ہو ہی نہیں سکتی، قربِ قیامت کی ان علامات سے بھی جو متذکرہ بالا احادیث میں بیان ہوئی ہیں شاید ہی کوئی مسلمان اختلاف کرے۔ الا یہ کہ ان کے بعض الفاظ کی تعبیر و تاویل میں کسی جزوی اختلاف کی گنجائش ہو۔ اسی طرح عین وقوعِ قیامت کے وقت جن واقعات و حوادث کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ بھی جدید سائنسی نظریات کے پیش نظر کچھ ایسے مستبعد اور ”آن ہونے“ نظر نہیں آتے، جیسے مثلاً سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، یا زمین کا تین مقامات پر ”خسف“ یعنی بری طرح دھنس جانا، یا بہت عظیم آگ، یا بے پناہ دھواں! اس لئے کہ جدید طبیعیات کے نزدیک جس طرح اس وقت کل کائنات ایک عظیم پھیلاؤ کی حالت میں اپنے محور پر تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہوئے گھلتی اور پھیلتی جا رہی ہے، اسی طرح ایک وقت آئے گا کہ وہ برعکس رخ پر چکر کھاتی ہوئی سکڑتی اور سمٹی چلی جائے گی، تو یہ کیا

بعید ہے کہ اس بڑی قیامت سے قبل کی چھوٹی قیامت کے موقع پر نظامِ شمسی میں وہ اختلال پیدا ہو جائے اور زمین کی گردش ص ”لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام ٹوٹا“ کے انداز میں مغرب سے مشرق کی بجائے مشرق سے مغرب کی جانب ہو جائے جس کے نتیجے میں سورج مغرب سے طلوع ہونے لگے، مزید برآں جیسے کہ سورۃ القیامہ کی آیات ۸ اور ۹ میں وارد ہوا ہے، چاند اور سورج یکجا ہو جائیں اور چاند سورج میں دھنس جائے اور خود زمین پر بھی اتنے بڑے بڑے شہاب گریں کہ وہ تین جگہ سے بری طرح دھنس جائے اور اس دھنسنے کے باعث اس کے اندر کی گیس اور آگ کا طوفان ابل پڑے۔

البتہ درمیانی عرصہ کے چار عظیم واقعات کے بارے میں مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کا تو ایک معتد بہ حصہ شکوک و شبہات میں مبتلا ہے، بہت سے ایسے علماء و مفسرین بھی مذہب اور متردد ہیں جو عمدہ حاضر (بلکہ صحیح تر الفاظ میں ماضی قریب) کی نیوٹن کی سائنس پر مبنی ”عقلیت پرستی“ کا شکار ہو گئے۔ ان چار عظیم واقعات کی جانب اشارات تو اگرچہ قرآن مجید میں بھی موجود ہیں لیکن ان کی تفصیلی خبریں اور پیشینگوئیاں ان احادیث نبویہ میں وارد ہوئی ہیں جو کتاب الفتن کے مختلف ابواب میں شامل ہیں۔ ان عظیم واقعات کے مابین زمانی ترتیب یہ ہے: (۱) سب سے پہلے ”الملحمة الکبریٰ“ یعنی تاریخ انسانی کی ”عظیم ترین جنگ“ جس کی جانب اشارہ سورۃ الکہف کی دوسری آیت میں ”بَنَاسَا شَدِيدًا“ کے الفاظ میں وارد ہوا ہے، لیکن جس کی تفصیل کتب حدیث کے ”باب الملاحم“ میں بیان ہوئی ہیں۔ (۲) ”المسیح الدجال“ کا خروج اور اس کے ہاتھوں مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کی عظیم تباہی یا بالفاظ دیگر اس کے ذریعے ”امیتین“ پر اللہ کے عذاب کے دورِ ثانی کی تکمیل۔ (۳) حضرت عیسیٰ ابن مریم کا نزول اور ان کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یودیوں کا آخری قلع قمع یا بالفاظ دیگر اللہ کا عذاب استیصال چنانچہ جہاں تک نزولِ عیسیٰ کا تعلق ہے اس کا بھی واضح اشارہ سورۃ الزخرف کی آیت ۶۰ میں

لَوْ خَسَفَ الْقَمَرُ ۖ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۖ

ترجمہ: ”اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ اور سورج اور چاند یکجا ہو جائیں گے۔“

ان الفاظ میں موجود ہے کہ: "وَإِنَّكُمْ لَعَلَّمٌ لِلْسَّاعَةِ" یعنی "وہ (یعنی عیسیٰ) ایک نشانی ہیں قیامت کی!"۔ اور بالآخر (۴) اسلام کا عالمی غلبہ اور پورے کرہ ارضی پر خلافت علی منہاج النبوت کے نظام کا قیام!

۱۷ مئی ۱۹۹۳ء

اسلام کا عالمی غلبہ یا عالمی نظامِ خلافت کا قیام

قیامت سے قبل کے چار عظیم واقعات میں سے جہاں تک آخری یعنی اسلام کے عالمی غلبے کا تعلق ہے، اگرچہ اس کی کوئی قطعی نص تو کم از کم راقم کے علم کی حد تک قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے، تاہم منطق کے اس تھینے کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں قرآن مجید میں بہ تکرار و اعادہ وارد ہوئے ہیں جس کا لازمی نتیجہ دین حق کا عالمی غلبہ ہے۔ چنانچہ تین بار قرآن حکیم میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ: **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ** یعنی ”وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (اسلام) دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کل کے کل دین (نظام زندگی) پر!“ اور دو مرتبہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ یہ الفاظ بھی وارد ہوئے کہ: ”یہ لوگ (اور یہاں اصلاً مراد یہود ہیں) اس لئے کہ دونوں مقامات پر متصلاً قبل یہود ہی کا ذکر ہے) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منوںوں (کی پھونکوں) سے بجھا دیں جبکہ اللہ اپنے نور کو لازماً مکمل فرما کر رہے گا“ خواہ یہ ان کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو!“ گویا ان پانچ آیات پر مشتمل تو صغریٰ ہے، اور کبریٰ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوع انسانی اور کل عالم انسانیت کی جانب ہے اور حسن اتفاق سے یہ مضمون بھی قرآن حکیم میں قدرے مختلف الفاظ میں پانچ ہی بار وارد ہوا ہے۔ یعنی: (۱) ”ہم نے نہیں بھیجا ہے (اے نبی ﷺ) آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے

۱۔ سورۃ التوبہ آیت ۳۳، سورۃ الفتح آیت ۲۸، سورۃ الصف آیت ۹

۲۔ سورۃ التوبہ آیت ۳۲ اور سورۃ الصف آیت ۸

بشیر اور نذیر بنا کر" (۲) "ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر" (۳) "بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے اپنے بندے پر الفرقان نازل فرمایا تاکہ وہ تمام جہان والوں کو خبردار کرے والا بن جائے" (۴) سورۃ الجمعہ کی آیات ۲ اور ۳ میں فرمایا کہ آپ کی بعثت صرف "امّتیّن" یعنی عربوں ہی کے لئے نہیں "آخرین" یعنی دوسروں کے لئے بھی ہے اور (۵) سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۸ میں آپ کو حکم دیا گیا: "کہہ دیجئے کہ لوگو! میں تم سب کی جانب اللہ کا رسول ہوں!"۔۔۔۔۔ اب صغریٰ اور کبریٰ کو جمع کر لیجئے تو یہ لازمی منطقی نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے کہ آپ کی بعثت کا مقصد یہ تمام و کمال اسی وقت پورا ہو گا جب پورے عالم انسانی یعنی کل روئے ارضی پر آپ ﷺ کے لئے ہوئے دین کا حتمی غلبہ ہو جائے گا۔ گویا بقول اقبال۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

رہیں احادیثِ نبویہ تو ان میں تو یہ خبر نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ دی گئی ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایک حدیثِ مبارک تو وہ ہے جس کی رو سے دنیا میں وہ نظام ایک بار پھر قائم ہو کر رہے گا جو آپ ﷺ کے زمانے میں قائم ہوا تھا اور آپ کے انتقال کے بعد بھی کم از کم تیس برس تک اپنی کامل اور آئینہ دار صورت میں برقرار رہا۔ اسے امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت نعمان بن بشیرؒ سے روایت کیا ہے اور اس کے مطابق آنحضور ﷺ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "تمہارے مابین نبوت موجود رہے گی" (آپ کا اشارہ خود اپنی ذاتِ اقدس کی جانب تھا) جب تک اللہ چاہے گا پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھالے گا۔ اس کے بعد نبوت کے طریقے پر خلافت قائم

لَوْ مَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا حَافَةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا: ۲۸)

يَوْمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانعام: ۱۰۷)

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (الفرقان: ۱)

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف: ۱۵۸)

ہوگی اور یہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ قائم رہے، پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر کاک کھانے والی (یعنی خالم) ملکیت آئے گی اور وہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر مجبوری کی ملکیت (غالبا مراد ہے مغربی استعمار کی غلامی) کا دور آئے گا اور وہ بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔ اور پھر دوبارہ نبوت کے طریق پر خلافت قائم ہوگی۔“ راوی کے قول کے مطابق اس کے بعد آپ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ (اور آپ کی یہ خاموشی بھی بلا سبب نہ تھی، تاہم اس کا بیان بعد میں ہوگا)۔ اس حدیث کی ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ جب وہ نظام دنیا میں دوبارہ قائم ہو جائے گا تو آسمان بھی اپنی ساری برکات نازل فرما دے گا اور زمین بھی اپنی تمام برکتیں باہر نکال کر رکھ دے گی۔ (چنانچہ بعض دوسری احادیث میں ان برکات کی تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں)

پھر دو نہایت اہم احادیث وہ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب جو خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہو گا وہ پورے عالم انسانیت اور کل روئے ارضی کو محیط ہوگا۔ چنانچہ (۱) صحیح مسلمؒ میں حضرت ثوبانؓ (جو آنحضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے) سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ نے میرے لئے پوری زمین کو سمیٹ یا سکیڑ دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لئے اور تمام مغرب بھی، اور سن رکھو کہ میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے سکیڑ یا لپیٹ کر دکھائیے گئے!“ اور (۲) مسند احمد ابن حنبلؓ میں حضرت مقداد ابن الاسودؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ”کل روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے گا نہ ہوا گھریاتی رہے گا نہ اونٹ کے بالوں کے کبیلوں سے بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کر دے، خواہ کسی عزت کے مستحق کے اعزاز کے ساتھ اور خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کے ذریعے۔ یعنی یا تو اللہ انہیں عزت دے گا اور اہل اسلام میں شامل کر دے گا یا انہیں مغلوب کر دے گا چنانچہ وہ اسلام کی بالادستی قبول کر لیں گے!“ حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ اس پر میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ ”تب وہ بات پوری ہوگی (جو سورۃ

الانفال کی آیت ۳۹ میں وارد ہوئی ہے کہ دین کل کا کل اللہ ہی کے لئے ہو جائے! الغرض، قیامِ قیامت اور دنیا کے خاتمے سے قبل کل روئے ارضی پر وہ دورِ سعادت یقیناً آکر رہے گا جس میں ”اللہ ایمان اور عمل صالح کی شرائط پوری کرنے والے مسلمانوں کو لازماً زمین کی خلافت اسی طرح عطا فرمائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو (مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ) عطا کی تھی، اور ان کے لئے ان کے اس دین کو زمین میں لازماً ممکن عطا فرماوے گا جسے اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے، اور ان کی خوفِ زدگی کی کیفیت کو لازماً امن و سکون کی حالت سے تبدیل کر دے گا!“۔۔۔ چنانچہ اسی کی کوئی جھلک دیکھ لی تھی عبدِ حاضر کے وڈنری، عبقری اور نابغہ انسان علامہ اقبال کی ”نگارِ تیز“ نے جب انہوں نے کہا تھا:-

آہاں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمتِ رات کی سیلاب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ جود
پھر جبینِ خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شبِ گریراں ہوگی آخر جلوہٴ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہٴ توحید سے!

اور اس میں بھی ہرگز کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس دورِ سعادت کی نوید ہندو دھرم کی کتابوں میں بھی موجود ہے، اس لئے کہ جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، دنیا کے تمام مذاہب اسلام ہی کی بدلی اور بگڑی ہوئی صورتیں ہیں، چنانچہ ان سب میں مکھوۃ نبوت

لَوْ عَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُنَظَّرَنَّ لَهُمْ دِينُهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ
وَلَيُزِيلَنَّ عَنْهُمْ بَعْدَ تَخَوُّفِهِمْ أَمْنًا (النور: ۵۵)

کے انوار کا کچھ نہ کچھ حصہ موجود اور برقرار ہے۔ چنانچہ پنڈت شری رام اچاریہ اپنی تحریر شائع شدہ ”اکھنڈ جیوتی“ بابت مارچ ۱۹۸۱ء میں لکھتے ہیں: ”ایسے ثبوت موجود ہیں کہ یگ بدلنے کا وقت آیا ہے۔ کل یگ (جسے عرف عام میں کلجگ کہ دیا جاتا ہے) اب ودولع ہو رہا ہے اور اس کی جگہ پر ایسا دور آرہا ہے جسے ست یگ (یعنی سچا زمانہ یا برحق زمانہ) کہا جاسکے۔ منو سرتی، لنگ پران اور بھاگوت میں دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق حساب پھیلانے سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ دور بحران کا دور ہے۔۔۔۔۔ ان سب اعداد و شمار کو دیکھتے ہوئے وہ وقت ٹھیک ان ہی دنوں میں ہے جس میں یگ بدلنا چاہئے۔۔۔۔۔ یعنی ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۰ء تک بیس سال کا عرصہ۔“ (بحوالہ ”اگر اب بھی نہ جاگے تو۔۔۔۔۔“ تالیف مولانا شمس نوید عثمانی، شائع کردہ: روشنی پبلشنگ ہاؤس، بازار نصر اللہ خاں، رام پور۔ یوپی۔ بھارت)۔۔۔۔۔ تو اس وقت اس امر سے تو بحث نہیں ہے کہ پنڈت جی کا حساب کتاب صحیح ہے یا نہیں لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ دور سعادت کی یہ نوید اور خوشخبری قرآن حکیم کے اشارات (گویا دلالت النقص) اور حدیث نبویؐ کی تصریحات (گویا عبارة النقص) کے عین مطابق ہے۔ اس پر مزید اضافہ فرمائیے اس کا کہ حضرت مسیحؑ کی آمد مانی جو عیسائیوں کے جملہ فرقوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے زمین پر ”آسمانی بادشاہت“ اور ”خدائی عدالت“ کے قیام ہی کے لئے ہوئی۔ گویا ”متفق گردید رائے بوعلی بارائے من“ کے مصداق اسلام کے نظام عدل و قسط یعنی خلافت علی منہاج النبوت کا عالمی سطح پر قیام اپنوں اور بیگانوں سب کے نزدیک مسلم ہے اور گویا تقدیرِ مہرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس موقع پر اس امر کا تذکرہ بھی یقیناً مفید ہوگا کہ اپنی معرکہ الآراء تصنیف ”آئیڈیالوجی آف فیوچر“ میں علامہ اقبال کے نظریہ خودی کی خالص فلسفیانہ سطح پر مدلل ترین اور مبسوط ترین تشریح کرنے والے ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم نے قیامت سے قبل اسلام کے نظام عدل و قسط کے عالمی سطح پر قیام کو نظریہ ارتقاء کا لازمی اور منطقی نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک ارتقاء کی پہلی منزل خالص کیمیائی اور طبیعیاتی ارتقاء کی تھی جس کے نتیجے میں سادہ کیمیائی عناصر نے ان پیچیدہ حیاتیاتی مرکبات کی صورت اختیار

کی جن میں حیات کا ظہور ممکن ہوا۔ اس کے بعد حیاتیاتی ارتقاء کا عمل شروع ہوا جو حضرت آدمؑ کی تخلیق پر اپنے مرتبہ کمال کو پہنچ گیا۔ پھر ذہنی اور نفسیاتی ارتقاء کا سفر شروع ہوا جو حضرت ابراہیمؑ کی ذات میں اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ پھر سماجی اور تمدنی ارتقاء کا آغاز ہوا جو نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ اور آپؐ پر ”ذین حق“ کی تکمیل اور سماجی اور تمدنی عدل و قسط کے نظام کے بالفعل قیام پر اپنے مہمائے کمال کو پہنچ گیا۔ اب ارتقاء کے اس طویل سفر کا صرف ایک ہی مرحلہ باقی ہے اور وہ ہے اس نظام کے عالمی سطح پر قیام کا۔۔۔۔۔ اس کے بعد چونکہ موجودہ تخلیق جن اصول و قواعد اور حدود و قیود کے ساتھ ہوئی ہے ان میں ارتقاء کی کوئی اور جست اور سمت ممکن نہیں ہے لہذا اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ اور اسی کا نام قیامت ہے! گویا قیامت سے قبل محمد ﷺ پر کامل ہونے والے دین حق کا پورے عالم انسانی اور کل روئے ارضی پر غلبہ سفر ارتقاء کی وہ آخری اور لازمی منزل ہے جس کی جانب وہ کاروان انسانیت کشاں کشاں رواں ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل بجا طور پر کہا تھا۔

یا ز نور مصطفیٰ اور را بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ ست!

البتہ ایک اور خبر جو بعض دوسری احادیث میں وارد ہوئی ہے یہ ہے کہ ”ہر کمالے را زوالے“ کے مطابق اس دور سعادت کے بعد بھی ایک ایسا دور آئے گا جس میں پوری زمین پر ایک انسان بھی اللہ اللہ کہنے والا باقی نہیں رہے گا (مسلم عن انس رضی اللہ عنہ) اور دنیا میں صرف ”بدترین خلائق“ ہی رہ جائیں گے (مسلم عن عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ) چنانچہ قیامت ان ہی پر قائم ہوگی۔ یہ غالباً اس لئے ہو گا کہ صاحب ایمان اور نیک بندوں کو قیامت کی ہولناکیوں اور سختیوں سے بچالیا جائے۔ چنانچہ صحیح مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس مضمون کی احادیث مروی ہیں کہ جب خلافت علی منہاج النبوت کا وہ دور سعادت جتنا عرصہ اللہ چاہے گا قائم رہ چکے گا تو دفعۃً ایک پاک اور ٹھنڈی ہوا ایسی چلے گی جس سے ہر وہ شخص موت کی نیند سو

جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو گا۔۔۔۔۔ چنانچہ اس کے بعد دنیا میں صرف بے ایمان اور بدکار لوگ ہی باقی رہ جائیں گے اور وہی جہنم کے اخروی عذاب سے قبل ہولناک زلزلہ قیامت کی سختیاں بھی جھیلیں گے!۔۔۔۔۔ اور یہی سب معلوم ہوتا ہے اس سکوت اور توقف کا جو حضرت نعمان ابن بشیرؓ کی روایت کے مطابق آنحضور ﷺ نے دوسری بار ”خلافت علیٰ منہاج الثبوت“ کے قیام کی نوید کے بعد اختیار فرمایا تھا۔ یعنی اس دورِ سعادت کے تذکرے کے فوراً بعد آپ ﷺ نے اس دورِ نحسوت کا ذکر مناسب نہیں خیال فرمایا۔ واللہ اعلم!

اب جہاں تک ان عظیم حوادث و واقعات کا تعلق ہے جو اسلام کے عالمی غلبہ سے قبل پیش آنے والے ہیں یعنی ایک عظیم اور نہایت ہولناک اور تباہ کن جنگ، دجال کا خروج، حضرت عیسیٰؑ کا نزول، اور ان کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یہودیوں کا استیصال، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، اور ان کے علاوہ، بلکہ ان ہی کے ذیل میں یا جوج ماجوج کا سیلاب، بیعتِ مہدیؑ اور ”دَابَّةُ الْأَرْضِ“ کا ظہور وغیرہ تو واقعہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت تو ان کا ذکر بھی پسند نہیں کرتی، رہے علماء دین تو ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کے لئے ان کا انکار تو ممکن نہیں ہے، تاہم ماضی قریب کے بعض نامور علماء اور مفسرین بھی ان کے بارے میں کم از کم مذہب اور متردد ضرور رہے ہیں اور موجودہ علماء میں سے بھی بہت سے ان کی عقلی اور سائنسی توجیہ یا استعاراتی تاویل کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔

اس صورت حال کے بعض اسباب تو عمومی ہیں اور بعض خصوصی۔ عمومی اسباب میں سے چند یہ ہیں:

(۱) اگرچہ خالص سائنس کی دنیا میں تو نیوٹن کی طبیعیات کا دور ختم ہو چکا ہے لیکن عوامی سطح پر یورپ اور امریکہ تک میں تاحال اسی کے جلد نظریات و تصورات کا سکہ رواں

ہے لہذا عام طبعی قوانین کے خلاف کسی بات کو تسلیم کرنے کے لئے ذہن بالعموم تیار نہیں ہیں (گذشتہ سال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے اپنے سالانہ محاضرات قرآنی کے لئے انگلستان کے نو مسلم سکالر جناب عبدالکلیم کو دعوت دی تھی جو حکمت تبلیغ کے تحت مغرب میں اپنا سابق نام گائی لیٹن ہی استعمال کرتے ہیں۔ اور انہوں نے بھی اپنے ایک خطبے میں اسی بات کی گواہی دی تھی کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر لوگ تاحال ذہنی اعتبار سے نیوٹونین فزکس ہی کے دور میں جی رہے ہیں۔)

(۲) عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی باتوں پر توجہ سے جذبہ عمل کمزور پڑ جاتا ہے، اور ذہنی اور نفسیاتی طور پر لوگ کسی ”مردے از غیب“ کے انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بات خام اور نیم پختہ اذہان کے اعتبار سے درست بھی ہے!

(۳) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان ہی چیزوں کا سہارا لے کر امت کی تاریخ کے دوران مختلف مواقع پر شہرت و عزت اور نام و نمود کے خواہاں حوصلہ مند لوگ مختلف دعوے کر کے عوام کے دین و ایمان کے لئے فتنہ کا سامان فراہم کرتے رہے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ بات درست نہیں!

ان پر مستزاد ہیں وہ دو خصوصی اسباب جن کا تعلق ان دو فتنوں سے ہے جو گذشتہ صدی کے اواخر میں سائنسی عقلیت کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی پیدا ہوئے اور تاحال پروان چڑھ رہے ہیں۔ یعنی (۱) فتنہ قادیانیت اور (۲) فتنہ استخفاف و انکار حدیث۔ ان میں سے مؤخر الذکر نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت کے ذہنوں میں حدیث نبویؐ کی وقعت و اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کے اذہان اس فتنے سے زیادہ مسوم ہیں وہ تو حدیث نبویؐ کی محبت کا صریح انکار کر دیتے ہیں، باقی بھی عملاً اس کی جانب سے ”غضن بصر“ اور صرف نظری روش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ رہا مقدم الذکر فتنہ تو اس کے بانی اور مؤسس نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ غضب ڈھایا کہ نہ صرف خود مجدد اور مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا بلکہ۔

”آنے والے سے مسیح ناصری“ مقصود ہے

یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کی صفات“

کی بحث چھیڑ کر اور پھر خود ہی کو مثیل مسیح اور مسیح موعود قرار دے کر نزول مسیح کا باب ہی بند کر دیا۔ (جس کے لئے ”رفع مسیح“ کا انکار بھی لامحالہ ضروری تھا!)

لیکن اس حقیقت سے قطع نظر کہ ان واقعات و حوادث کے سلسلے کی پہلی کڑی یعنی ایسی ہولناک اور تباہ کن جنگ جس کا میدان مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں گے اب بالکل نوشتہ دیوار کے مانند سامنے کی بات ہے، اور ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ جہاں تک ان واقعات و حوادث کی ان تفصیل کا تعلق ہے جو احادیث میں وارد ہوئی ہیں ان میں یقیناً استعاراتی زبان بھی استعمال ہوئی ہے اس لئے کہ اب سے چودہ سو برس قبل آج کے سلاح جنگ اور ذرائع رسل و رسائل کا بیان اسی طور سے ممکن تھا، اور مختلف راویوں کی روایات میں لفظی فرق اور زمانی ترتیب کا گڈمڈ ہو جانا بھی عین قرین قیاس ہے، جہاں تک ان کے مجموعی خاکے کا تعلق ہے، راقم اپنے مطالعہ اور فہم القرآن کی بناء پر پورے انشراح صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ قرآن کے فلسفہ و حکمت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ اور بالخصوص قرآن کے اس قانونِ عذاب کے عین مطابق ہے جو صفحات گزشتہ میں بیان ہو چکا ہے۔

اب تک کے مباحث کا خلاصہ

اب آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس سلسلہ مضامین کی کڑیوں کو ذہن میں جوڑ لیا جائے جو اس سے قبل بیان ہو چکے ہیں۔ ان کا نقطہ آغاز ایک ایسا خیال تھا جو صر ”آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں!“ کے مصداق اپنے بیرونی سفر کے دوران ایک روز اچانک ذہن میں بجلی کی مانند کوند گیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہم قرآن مجید میں ”صَبَرْتُ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَبَاءُ وَبَغَضِبَ مِنَ اللَّهِ“ کے الفاظ پڑھتے ہوئے آرام کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے گذر جاتے ہیں کہ یہ یہود کا ذکر ہے، حالانکہ موجودہ معروضی صورت حال میں ان الفاظ کا مصداق کابل یہود نہیں ہم ہیں! پھر اس پر راقم اپنے قیام حرمین شریفین کے دوران بھی مسلسل غور کرتا رہا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اور اسی غور و فکر کا حاصل تھا جو پہلے ۲۵ مارچ ۹۳ء کو خطاب عید الفطر میں بیان ہوا اور اس کے بعد سے زیر نظر مضامین کی صورت میں پیش ہو رہا ہے جو روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوئے۔

اس سلسلے کا پہلا مضمون ”ہیں آج کیوں ذلیل؟“ کے عنوان سے ۱۶ اپریل کو شائع ہوا تھا جو متذکرہ بالا خیال ہی کی وضاحت پر مشتمل تھا کہ آج یہودی تو دنیا میں کل چودہ ملین یعنی ڈیڑھ کروڑ سے بھی کم ہونے کے باوجود بالفعل دولت و ثروت اور عزت و وجاہت کی چوٹی پر متمکن ہیں، یہاں تک کہ علامہ اقبال کے اس قول کے عین مطابق کہ ”فرنگ کی رگ جال پنجہ یہود میں ہے!“ وہ دنیا کی عظیم ترین اور وقت کی واحد سپریم پاور یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو کنٹرول کر رہے ہیں، جبکہ ہم مسلمان ڈیڑھ ارب کے لگ

بھگ ہونے کے باوجود ”کس نئی پُر سد کہ بھیا کیستی؟“ کی سی کیفیت سے دوچار ہیں۔ البتہ یہ وضاحت اسی وقت کردی گئی تھی کہ یہ صورت حال مستقل نہیں، عارضی ہے اور بہت جلد بالکل برعکس ہو جانے والی ہے۔ پھر ۲۳ اپریل کو شائع ہوئی تھی راقم کی وہ تحریر جس کے بارے میں راقم کو اپنی کم علمی کے باوصف یہ ”ذم“ ہے کہ اس اچھوتے موضوع پر شاید ہی کبھی کسی نے اس وضاحت کے ساتھ لکھا ہو یعنی ”قرآن کا قانونِ عذاب“۔ اور اب ہمیں اپنے موضوع کے جس حصے کی جانب پیش قدمی کرنی ہے یعنی وہ عظیم حوادث اور تباہ کن واقعات جو حدیثِ نبویؐ میں وارد شدہ پیشین گوئیوں کے مطابق مستقبل قریب میں پیش آنے والے ہیں، ان کے پس پردہ کارفرما حکمتِ خداوندی کے فہم کے لئے ضروری ہے کہ اس قانونِ عذابِ الہی کی بعض دفعات کو پھر زمین میں تازہ کر لیا جائے۔ یعنی (۱) اولاً یہ کہ یہ دنیا اصلاً دارالامتحان ہے دارالجزاء نہیں! لیکن (۲) یہ قاعدہ کلیہ پوری طرح صرف افراد پر منطبق ہوتا ہے، قوموں اور ملتوں پر نہیں! (بقول اقبال۔ ”فطرت افراد سے اغماض بھی کرتی ہے۔ نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف؟“) چنانچہ قوموں اور امتوں کا مجموعی حساب دنیا ہی میں چکادیا جاتا ہے۔ (۳) دنیا میں ”عذابِ اکبر“ یعنی اللہ کے اجتماعی عذاب کی عظیم ترین صورت ”عذابِ استیصال“ کی ہے جس کے ذریعے پوری پوری قوموں کو نسیا منسیا کر دیا گیا اور انہیں بخ و بن سے اکھاڑ کر ان کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ اور یہ صورت ان قوموں کے ساتھ پیش آئی جن کی جانب کوئی رسول مبعوث کیا گیا اور اُس نے اپنی دعوت و تبلیغ اور قوی و عملی شہادت کے ذریعے اتمامِ حجت کا حق بدرجہ تمام و کمال پورا کر دیا لیکن اس کے باوجود قوم نے بحیثیتِ مجموعی کفر اور انکار کی روش پر اصرار کیا جیسے قومِ نوحؑ، قومِ ہودؑ، قومِ صالحؑ، قومِ لوطؑ، قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعونؑ۔ (۴) اس سے کمتر لیکن پیہم اور متواتر عذاب ان لوگوں پر آتا رہا جنہوں نے رسولوںؑ کی دعوت پر لبیک کہہ کر امتِ مسلمہ کی حیثیت اختیار کی اور اس حیثیت میں اللہ کے ساتھ عمد و میثاق کا رشتہ استوار کیا لیکن پھر امتدادِ زمانہ کے باعث اپنے قول و قرار سے انحراف کرتے ہوئے شریعت کی حدود کو پامال کرنے اور اللہ کی کتاب کو پس پشت

پھینک دینے کی روش اختیار کر لی۔ چنانچہ یہ ہے عذابِ اجتماعی کی وہ دوسری شکل جس کے کوڑے سابقہ امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی پیٹھ پر بھی عظیم پڑتے رہے اور موجودہ امتِ مسلمہ یعنی ہم مسلمانوں پر بھی متواتر برس رہے ہیں۔

اس کے بعد جو مضمون جمعہ ۳۰ اپریل اور ہفتہ یکم مئی کو دو قسطوں میں شائع ہوا اس میں دو نکات کی وضاحت کی گئی یعنی: (۱) یہ کہ اگرچہ دنیا میں انبیاء اور رسول تو بہت سے گزرے ہیں لیکن صاحبِ کتاب اور حاملِ شریعت امتیں پوری انسانی تاریخ کے دوران دو ہی ہوئی ہیں: سابقہ امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور موجودہ امتِ مسلمہ یعنی امتِ محمد ﷺ اور (۲) بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک بنی اسرائیل کی لگ بھگ ساڑھے تین ہزار سال کی تاریخ اور امتِ مسلمہ کی تیرہ سو سالہ تاریخ کے بائین نبی اکرم ﷺ کے اس قول مبارک کے مطابق حد درجہ مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے کہ: ”میری امت پر بھی لازماً وہ سارے احوال واقع ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسی مشابہت کے ساتھ جو ایک جوڑی کی ایک جوتی کو دوسری جوتی سے ہوتی ہے!“ (ترمذی) عن عبد اللہ بن عمروؓ ابن العاص (چنانچہ اس عرصے کے دوران سابقہ امتِ مسلمہ بھی دو بار عروج سے ہمکنار ہوئی، اور دو مرتبہ زوال سے دوچار ہوئی اور موجودہ امتِ مسلمہ یعنی مسلمان بھی دو ہی بار عزت و وجاہت اور قوت و سطوت کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہوئے اور دو ہی مرتبہ ذلت و مسکنت کے قعرِ مذلت کی انتہائی پستیوں میں گرے۔) (بقول اقبال۔) ”پیشِ مایک عالمِ فرسودہ است۔ ملت اندر خاکِ او‘ آسودہ‘ است!“

اس کے بعد ۷ اور ۸ مئی کو دو ہی قسطوں میں ”بیسویں صدی عیسوی اور سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں“ کے عنوان سے مضمون شائع ہوا، جس میں واضح کیا گیا کہ بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بہت عجیب و غریب منظر پیش کرتی ہے کہ اس کے دوران ایک جانب دونوں امتوں پر حسبِ سابق عذابِ الہی کے کوڑے بھی برستے رہے، چنانچہ یہودیوں پر ”ہالوکسٹ“ کی صورت میں ہٹلر کے ہاتھوں عذابِ الہی کا شدید ترین کوڑا پڑا، تو دوسری جانب مسلمانوں میں سے افضل تر جیسے یعنی عربوں کے سینے میں اسرائیل کا خنجر

بیوست ہوا اور اس پر مستزاد اس کے ہاتھوں انہیں پہلے ۱۹۳۸ء میں اور پھر ۱۹۶۷ء میں عبرتناک ہی نہیں نہایت شرمناک ہزیمت کا مزہ چکھنا پڑا۔ یہاں تک کہ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی ہوئی اور وہ اس کی تولیت سے محروم ہو گئے۔ اور غیر عرب مسلمانوں میں سے بھی پاکستانی قوم کو ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ اور المیہ مشرقی پاکستان کی صورت میں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن دوسری جانب اس صدی کے دوران دونوں ہی امتوں میں احیاء اور نشاۃ ثانیہ کا عمل بھی شروع ہوا۔ اگرچہ اس کی ترقی اور پیش قدمی کی رفتار سابقہ امت یعنی یہود میں بہت تیز رہی جبکہ اس کے مقابلے میں امت مسلمہ کا احیائی عمل نہایت سست رفتار رہا چنانچہ یہود کی ترقی کی سرعت رفتار کا عالم تو یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء میں ان کے چند ”بزرگوں“ (”Elders of the Zion“) نے جو سکیم تیار کی تھی اس کا پہلا شمارہ کل بیس ہی برس بعد ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کے ”اعلان بالفور“ کی صورت میں سامنے آگیا۔ اور پھر کل تیس برس بعد ۱۹۳۸ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں آگیا۔ اور اس وقت واقعی صورت حال یہ ہے کہ جہاں ایک جانب اسرائیل بذات خود بھی ایک بہت بڑی عسکری قوت ہے، اور اس پر مستزاد اسے پوری عیسائی دنیا کی حمایت و نصرت بھی حاصل ہے، وہاں دوسری جانب وقت کی واحد سپر پاور تو یہود کے شکبے میں جکڑی ہوئی ہے ہی، پوری دنیا کے مالیاتی نظام پر بھی ان کا کامل تسلط ہے اور عالمی معیشت کا لیور تو اس طرح ان کے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہیں ذرا سی جنبش کے ذریعے عظیم ترین سلطنتوں کو تہہ و بالا اور ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیں۔ (جس کی ایک نمایاں مثال سوویت یونین کا حالیہ حشر ہے!) چنانچہ اس وقت حقیقی اور واقعی صورت حال یہ ہے کہ ”عظیم تر اسرائیل“ کے قیام کے لئے عملی اقدام میں کوئی تاخیر یہود اور اسرائیل کی اپنی حکمت عملی ہی کے تحت تو ہو سکتی ہے، دنیا میں کوئی دوسری ایسی طاقت بالفعل موجود نہیں ہے جو اس کی راہ میں مزاحم ہو سکے! -----

دوسری طرف مسلمانانِ عالم بھی نہ صرف یہ کہ مغربی استعمار کی براہ راست غلامی سے نجات حاصل کر چکے ہیں بلکہ ان میں اپنے اصل تشخص کی بازیافت اور اپنی تہذیب و تمدن کے احیاء اور اسلام کو ایک ”دین“ یعنی نظام زندگی اور سسٹم آف سوشل جینٹس کی

حیثیت سے قائم و نافذ کرنے کی شدید امنگ پیدا ہو چکی ہے جس کی لہر مشرق سے مغرب تک پورے عالم اسلام میں۔ ”ہے ایک ہی نفعہ کہیں اونچا کہیں مدہم!“ اور ”ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم!“ کی شان کے ساتھ روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس ”احیائی دور“ میں یہودی مسلمانوں سے بہت آگے نکل چکے ہیں اور دراصل اسی معروضی حقیقت میں آئندہ پیش آنے والے عظیم حوادث اور ہولناک واقعات کا راز مضمر ہے جس پر مفصل گفتگو آئندہ ہوگی۔

اس کے بعد دو ہی اقساط میں، یعنی ۱۳ اور ۱۶ مئی کو وہ تحریر شائع ہوئی جس میں ”ابراہیمی مذاہب کا ثالث ثلاثہ“ کے عنوان سے یہ حقائق واضح کئے گئے کہ: (۱) عیسائیت اپنی اصل اور آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً ابراہیمی مذاہب ہی کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار سابقہ امت مسلمہ ہی کا ”فرقہ“ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن سینٹ پال کی ترمیمات کے نتیجے میں موجودہ عیسائیت ایک بالکل جداگانہ مذہب کی صورت اختیار کر چکی ہے جس کا کوئی حقیقی اور معنوی تعلق ابراہیمی مذاہب کے ساتھ باقی نہیں رہا (۲) یہودیوں اور مسلمانوں، دونوں پر عذاب الہی کے دوسرے دور کے ضمن میں یورپ کی عیسائی اقوام ہی ”کوڑے“ کے طور پر استعمال ہوتی رہیں۔ چنانچہ یہودیوں پر بھی چوتھی صدی عیسوی کے بعد سے آج تک سارا تشدد اور کل تعذیب عیسائیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی اور مسلمانوں پر بھی پہلے دور عذاب کی ابتدا بھی صلیبیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اگرچہ اُس وقت اصل عذاب تآمریوں کے ہاتھوں آیا تھا، لیکن دوسرے دور عذاب کے دوران تو جو چودھویں اور پندرہویں صدی میں ہسپانیہ سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے سے لیکر بیسویں صدی کے اوائل میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمے تک جاری رہا عذاب الہی کے تمام کوڑے یورپ کی عیسائی اقوام ہی کے ہاتھوں پڑے۔ (چنانچہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے ضمن میں یہ حقیقت بھی بہت اہم رول ادا کرنے والی ہے!) (۳) یہودیوں نے نہایت ہوشیاری اور چابک دستی سے اپنے اڑی اور جانی دشمنوں یعنی عیسائیوں کو پہلے رام کیا اور پھر باقاعدہ زیر کر لیا۔ اس کے لئے انہوں نے پہلے ہسپانیہ کی فتح

میں مسلمانوں کی مدد کی، پھر مسلم اسپین کو اپنے مورچے اور کمین گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے عیسائی یورپ کی فہرست میں نقب لگائی اور علم و حکمت کے جو سوتے قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں سے پھوٹ کر یورپ کی جانب بہہ رہے تھے ان میں ”لبرلزم“ کے عنوان سے فکری آوارگی اور اخلاقی بے راہ روی کا زہر شامل کر کے ایک جانب یورپ کے معاشرے کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیا اور دوسری جانب ”پروٹیسٹنٹ ازم“ کی راہ سے کلیسا کی گرفت کو کمزور کر کے سودی کاروبار کی اجازت حاصل کر لی اور اس طرح یورپ کو اپنے اقتصادی شکنجے میں جکڑ لیا۔ چنانچہ اس وقت حقیقی اور معروضی صورت حال یہ ہے کہ پوری عیسائی دنیا پر فیصلہ کن غلبہ حاصل ہے ”واسپ“ (White Anglosexen Protestants) کو جن کے سرخیل ہیں امریکہ اور برطانیہ اور ان کے سر اور شانوں پر سوار ہے ”صہیونیت“ کا سازشی ٹولہ!

اور بالآخر جمعہ ۲۱ مئی اور اتوار ۲۳ مئی کو دو قسطوں میں شائع ہوئی ”آنے والے دور کی ایک واضح تصویر“ کے عنوان والی تحریر، جس کی پہلی قسط میں سب سے زیادہ حتمی و یقینی اور قطعی و شدنی بات کا تذکرہ ہوا یعنی قرآنی اصطلاح میں الواقعہ، القارعہ، الحاقہ اور التامہ کا ذکر، جسے عرف عام میں ”قیامت“ کہہ دیا جاتا ہے (حالانکہ اصل قرآنی اصطلاح کے مطابق قیامت کے لفظ کا اطلاق بحث بعد الموت کے بعد حساب کتاب اور جزا و سزا کے فیصلے کے دن یعنی ”یوم الدین“ پر کیا جاتا ہے) اور دوسری قسط میں اس سے قبل کے اتنے ہی حتمی اور یقینی واقعے کا تذکرہ ہوا جو قرآن حکیم سے ”دلائل النص“ اور احادیث نبویہ سے ”صراحت النص“ کے طریق پر تو ثابت ہے ہی، فلسفہ اقبال کے شارح ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی رائے میں نظریہ ارتقاء کے بھی منطقی اور لازمی نتیجے کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اسلام کا عالمی غلبہ! اور عالمی خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام!!

اب آئندہ ہمیں ان عظیم واقعات و حوادث پر گفتگو کرنی ہے جن کی تفصیلی خبریں احادیث نبویہ میں وارد ہوئی ہیں یعنی سلسلہ ملاحم اور المہتمم الکبریٰ، بیعت مہدی، خروج دجال، نزول مسیح، استیصال یہود اور خاتمہ عیسائیت، جن کے بارے ہم اپنی یہ حتمی اور

سوچی سمجھی رائے پیش کر چکے ہیں کہ ان کی واقعاتی تفصیل اور ان کے وقوع کے ٹائم ٹیبل سے قطع نظر، جہاں تک ان کے مجموعی نقشے کا تعلق ہے وہ دونوں مسلمان امتوں کی تاریخ اور قرآن کے اس قانونِ عذاب کے فریم میں بالکل فٹ بیٹھتا ہے جس کا اجمالی ذکر آج کی صحبت میں بھی ہو گیا ہے۔ آئندہ ہم ان میں سے ایک ایک کے بارے میں مختصر گزارشات پیش کریں گے۔ ان شاء اللہ العزیز !

۳۱ مئی ۱۹۹۳ء

پندرہویں صدی ہجری: توقعات اور اندیشے بارہ سال قبل کی گزارشات

۲ جون کو نماز عید الاضحیٰ سے فراغت کے بعد باغ جناح لاہور سے واپس آکر اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں کسی قدر خالی الذہن بیٹھا تھا کہ اچانک ذہن اس الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ غلبہ اسلام سے قبل کے حوادث یعنی سلسلہ ملائم، بیعت حضرت مدی، خروج دجال، نزول مسیح، استیصال یسود اور عیسائیت کے اسلام میں مدغم ہونے کو کس ترتیب اور اسلوب سے ضبط تحریر میں لایا جائے۔ اس لئے کہ احادیث صحیحہ میں وارد شدہ خبریں بھی اپنے مقام پر، اور میرا ایمان و یقین اور وثوق و اعتماد بھی اپنی جگہ، لیکن آج کا جدید تعلیم یافتہ انسان ان مباحث سے بے گار جبکہ واقع ہوا ہے اور ان پر گفتگو کو ضعیف الاعتقادی کا مظہر اور وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں سے بعض مباحث بہت تفصیل طلب ہیں جبکہ ایک روزنامے کے ”کالم“ کا مزاج اور اس کی محدودیت دونوں ان تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ میں کچھ دیر اسی اوجیز بن میں رہا لیکن پھر اچانک خیال آیا کہ اب سے دس بارہ سال قبل میں نے اس موضوع پر ایک مفصل تقریر کی تھی جو ماہنامہ ”میشاق“ میں شائع بھی ہو گئی تھی، کیوں نہ اسے دیکھا جائے شاید کہ معاملہ آسان ہو جائے۔ چنانچہ اسے نکال کر پڑھا تو ایک تو میں خود در طرہ حیرت میں ڈوب کر رہ گیا کہ اب سے ساڑھے بارہ سال قبل جو باتیں بہت دور و دراز نظر آتی تھیں اس عرصے کے دوران نوشتہ دیوار کی طرح عالم واقعہ میں رونما ہو چکی ہیں۔ اور دوسری طرف میری مشکل واقعتاً آسان ہو گئی اور دل نے یہی رائے دی کہ پہلے اس کے متعلق حصے قارئین ”نوائے وقت“ کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں۔ اس سے ایک اجمالی نقشہ قارئین کے سامنے

آجائے گا۔ پھر بعض معاملات کی کسی قدر وضاحت اور اس عرصے کے دوران پیش آمدہ واقعات سے استشاد کے ذریعے پورا مرحلہ باسانی طے ہو جائے گا اور اس طرح ان آراء میں اضافی وزن اس بناء پر پیدا ہو جائے گا کہ یہ خیالات ”شتے کہ بعد از جنگ یاد آید“ کے مصداق خلج کی جنگ کے بعد پیدا نہیں ہوئے بلکہ اس سے لگ بھگ دس سال قبل وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکے تھے۔

واضح رہے کہ یہ تقریر میں نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو اپنے دوسرے سفر امریکہ سے واپسی پر مسجد شہداء، ریگل چوک، لاہور، میں کی تھی۔ پھر اسے ٹیپ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے جوں کا توں ماہنامہ ”میشاق“ لاہور کی اشاعت بابت جنوری فروری ۸۱ء میں شائع کر دیا گیا تھا۔ سفر امریکہ کے دوران اس موضوع کی جانب میرا ذہن جن اسباب کی بناء پر منتقل ہوا ان میں بعض کا ذکر تو اس تقریر کے آغاز میں موجود ہے لیکن ایک اہم بات جو اُس وقت بیان ہونے سے رہ گئی تھی، یہ تھی کہ میں نے اپنے ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء کے امریکہ کے سفر کے دوران کثرت کے ساتھ یہ عکسز کاروں کے پچھلے شیشوں یا بمپرز پر چسپاں دیکھے کہ ”یسوع مسیح“ تشریف لارہے ہیں!“ (JESUS IS COMING) جس سے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت اور ان کے ورودِ ثانی کو ہمارے اور عیسائیوں کے مابین ایک بہت بڑی قدر مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ بہر حال اب اس تمہید کے بعد میری اس تقریر کے متعلقہ حصے ملاحظہ ہوں۔ میں نے اب اس میں تقریر کو تحریر کا انداز دینے کے لئے صرف کچھ لفظی تبدیلی اور تقدیم و تاخیر کا فرق کیا ہے اور بعض غیر ضروری تفصیل حذف کر دی ہیں ورنہ اصلاً یہ آج سے ساڑھے بارہ سال قبل ہی کی تقریر ہے۔

(اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام، اور ماثورہ دعاؤں

کے بعد عرض کیا گیا)

حضرات! میری آج کی گفتگو کا عجیب پہلو یہ ہے کہ مجھے اعلان کے مطابق ایک ہی نشست میں دو موضوعات پر گفتگو کرنی ہے، ایک موضوع تو میرے شمالی امریکہ کے حالیہ دورے کے تاثرات و مشاہدات سے متعلق ہے (تقریر کا یہ حصہ

اس وقت تو بالکلہ حذف کیا جا رہا ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اگر کسی موقع پر اسے بھی ہدیہ قارئین کیا جائے تو ان شاء اللہ مفید بھی ہوگا اور موجب دلچسپی بھی! اور دو سرا پندرہویں صدی سے تعلق رکھتا ہے جس کا آغاز ہو رہا ہے اور جس کو دوسرے مسلمان ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی سرکاری سطح پر منایا جا رہا ہے بلکہ اس کے استقبال کے لئے کافی پہلے سے مختلف تقاریر منعقد ہو رہی ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو کی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوئی کہ عوام الناس ہی نہیں ہمارے خواص کے بھی قلیل ذکر حصے میں چودھویں اور پندرہویں صدی کے متعلق عجیب و غریب باتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ باتیں کچھ تو ہمارے ان واعظین کے باعث پھیلی ہیں جن کا مبلغ علم صرف سنی سنائی باتوں اور سینہ بہ سینہ حاصل ہونے والی معلومات تک محدود ہوتا ہے پھر اس میں کافی دخل عوام الناس کی اس علت کا بھی ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں میں اپنی طرف سے اضافے بھی کرتے رہتے ہیں اور اس طرح بات کا بگاڑ بن جاتا ہے۔

اس موضوع پر کہ امت مسلمہ اور ملت اسلامیہ چودہ سو سال میں عروج و زوال کے مختلف اقدار سے گزرتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچی ہے اور فی الوقت ہم کس صورت حال سے دوچار ہیں میں پہلے بھی مفصل تقریریں کر چکا ہوں اور امت مسلمہ کے عروج و زوال کے دو دو ادوار کے متعلق میرے تجزیے اور میرے مطالعے کا حاصل تحریری شکل میں بھی آچکا ہے۔ لیکن علم مطالعہ اور مشاہدہ کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں بعض نئی باتیں حال ہی میں میرے سامنے آئی ہیں جن کو میں آج آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان نئی باتوں کی جانب ذہن منتقل ہونے کا سبب یہ حسن اتفاق ہوا کہ شہل امریکہ میں کافی عرصہ سے ایک اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن قائم ہے جس کا امریکہ کے مختلف شہروں میں ہر سال ایک کنونشن منعقد ہوتا ہے۔ پچھلے سال جب میں پہلی بار امریکہ گیا تھا تو ڈیلاس میں ان کے سالانہ کنونشن کا انعقاد ہو رہا تھا جس میں ایسوسی ایشن کی جانب سے مجھے مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا اور میں نے وہاں تقریر بھی کی تھی۔ اس سال میں جب دوسری مرتبہ دعوتی دورے

پر شمالی امریکہ گیا تو ان کا سالانہ کنونشن مشہور عالم آبشار نیواگر کے سامنے نیواگر اسٹی میں منعقد ہونے والا تھا جس میں شریک ہونے اور آخری اجلاس میں ”پندرہویں صدی ہجری کے چیلنج، خطرات اور توقعات“ کے عنوان پر ایک مقالہ پڑھنے کے لئے مجھے دعوت دی گئی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی نصرت و توفیق سے اس موضوع پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا جس کے دوران کچھ پہلو اور نکات ایسے ذہن میں آئے کہ میں نے چاہا کہ ان کو آپ کے سامنے بھی بیان کروں۔ (یہ مقالہ پاکستان میں روزنامہ ”مسلم“ اسلام آباد اور بھارت میں ہفت روزہ ”RADIANCE“ دہلی میں شائع ہو چکا ہے)

احادیث شریفہ میں قیامت کی جو علامات بتائی گئی ہیں ان کا مفاد یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے رہنمائی کا ذریعہ بنیں اور ہم چوکس و ہوشیار رہیں۔ البتہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے اور اس معاملے میں کوئی مغالطہ لاحق ہو تو اس کو دور کر لیجئے کہ کسی صدی کے تعین کے ساتھ، خواہ وہ چودھویں صدی ہو خواہ پندرہویں صدی، کوئی خبر نہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے نہ احادیث شریفہ میں۔ علامات قیامت کے باب میں احادیث نبویہ میں غور و فکر کرنے سے البتہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا کا ڈرامہ اپنے ڈراپ سین یعنی اختتام سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں وہ نقشہ اور وہ حالات تیار ہوتے نظر آ رہے ہیں جن کی خبریں الصادق المصدوق جناب محمد ﷺ نے دی تھیں۔ میں ان حالات کا جن سے اس کرۂ ارض کو مستقبل قریب میں سابقہ پیش آنے والا ہے، ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آج کی اس گفتگو میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس ضمن میں جامعہ مدنیہ لاہور کے مستم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہ (افسوس کہ مولانا موصوف کا انتقال ۳ مارچ ۱۹۸۸ء کو بالکل اچانک انداز میں ہو گیا غفر اللہ لنا ولہ و اَدْخِلْہُ فِی اَعْلٰی عِلٰیٰتِیْنِ۔۔۔ آمین) سے بہت مدد ملی ہے۔ مولانا موصوف نے اسی موضوع پر عید الاضحیٰ کے موقع پر تقریر بھی کی تھی پھر میرا اس موضوع پر ان سے آج ہی تبادلۂ خیالات بھی ہوا ہے اور اس گفتگو سے میری اپنی سوچ میں مزید چٹنگی پیدا ہوئی ہے۔ اور میری ان

گزارشات میں ان سے استفادہ بھی شامل ہے! قرب قیامت کی علامات کے بارے میں احادیث نبویہ میں جو کچھ بیان ہوا ہے ان سے ذہن میں آنے والے واقعات و حالات کی ایک ترتیب بھی بنتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ واقعات مختلف مراحل میں رونما ہوں گے۔ ہر مرحلے میں کتنی مدت صرف ہوگی اور کتنا عرصہ لگے گا اس کا تعین ممکن نہیں۔ لیکن مختلف احادیث نبویہ کو جمع کر کے غور و تدبر کیا جائے تو ایک اجمالی نقشہ اور خاکہ ذہن میں ضرور مرتب ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس طرح جو نقشہ میرے ذہن میں مرتب ہوا ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

احادیث شریفہ سے ایک بات تو یہ پورے جزم اور یقین کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ وقوع قیامت کے قریب کچھ جنگیں ہوں گی جن کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ایسی وسعت کی حامل ہوں گی کہ ان کے سامنے سابقہ تمام جنگوں کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ماند پڑ جائیں گی۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی جنگ میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے، اس جنگ میں بے پناہ خونریزی ہوگی اور نتیجے کے طور پر مسلمانوں اور عیسائیوں کی متحدہ قوت کو فتح و کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کے بارے میں احادیث شریفہ سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اس فتح کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں میں سخت تفرقہ اور اختلافات پیدا ہوں گے، عیسائی اس فتح کو اپنے مذہب، اپنے عقائد اور اپنی صلیب کی طرف منسوب کریں گے اور اس کو اپنے مذہب کی حقانیت کی دلیل بنائیں گے۔ چنانچہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور یہ تفرقہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مسلح معرکہ آرائی اور ایک شدید جنگ کی صورت اختیار کر لے گا جس میں مسلمانوں کو زبردست ہزیمت اور نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ چنانچہ ترکی، لبنان، شام اور عراق مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گے حتیٰ کہ عیسائی مسلمانوں کو شکست پر شکست دیتے اور دباتے ہوئے حجاز میں خیبر کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔ اس جنگ میں یہودیوں کی تمام دلی ہمدردیاں اور عملی تعاون عیسائیوں کو حاصل ہوگا

اور ان کا سر بلایہ، ان کی ٹیکنیکل مہارت، ان کے کارخانوں میں تیار ہونے والا
 میسب و ملک اسلحہ اور ان کے پراپیگنڈے کے ہتھیار سب عیسائیوں کی پشت پر
 ہوں گے لیکن خود وہ براہ راست جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ احادیث کے
 مطابق اس مرحلہ پر حضرت مہدیؑ کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ لیکن اسی موقع پر یہ
 بات بھی جان لیجئے کہ حضرت مہدیؑ کی حدیث نبویؐ میں بیان شدہ شخصیت اور
 اہل تشیع کی اعتقادی شخصیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان دونوں کے
 مابین سوائے لفظ اور نام کے اشتراک کے کوئی اور چیز مشترک نہیں ہے۔ وہ جس
 مہدیؑ کے ماننے والے ہیں، وہ ان کے بارہویں امام ہیں جو ان کے عقیدے کے
 مطابق روپوش ہو گئے تھے اور کسی غار میں مقیم ہیں اور اُس وقت وہی ظاہر ہوں
 گے۔۔۔۔۔ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ احادیث نبویہؐ سے ہمارے سامنے حضرت
 مہدیؑ کی شخصیت اور ان کے ظہور کا جو نقشہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ عرب کے
 ایک قاصد اور ایک رہنما کی حیثیت سے ابھر س گے۔ ان کا نام محمد ہو گا اور ان کے
 والد کا نام عبد اللہ۔ وہ بیٹ اللہ شریف میں کعبہ کا طواف کر رہے ہوں گے کہ
 لوگ ان کو پہچانیں گے کہ یہی مہدیؑ موعود ہیں۔ وہ خود مہدیؑ ہونے کے
 دعویدار نہیں ہوں گے بلکہ لوگ ان کو از خود پہچانیں گے اور کوئی ندائے غیبی اس
 امر کی تائید کرے گی۔ مسلمان ان کی قیادت میں متحد اور مجتمع ہو کر عیسائی قوتوں
 سے جنگ و قتال کریں گے اور ان کو پیچھے ہٹاتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچ جائیں
 گے۔ اور جب قسطنطنیہ کو عیسائیوں کے چنگل سے آزاد کرارہے ہوں گے تو پھر
 ایک اور مرحلہ شروع ہو جائے گا جس کو ہم تیسرا مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ وقت
 دجال اکبر کے ظہور کا ہو گا۔ اس کے ظہور کی خبر اس کے قبضے میں غیر معمولی
 اسلحہ اور عجیب و غریب کرشمے ہونے کے باعث تمام عالم میں آنا فانا پھیل جائے
 گی۔ بعض احادیث میں اگرچہ اس کے خروج کی جگہ اصفہان (ایران کا شہر) بتائی
 گئی ہے، لیکن وہ خود بھی یہودی النسل ہو گا اور یہودیوں کی مسلح اور بظاہر ناقابل
 تسخیر قوت اس کی پشت پر ہوگی۔ وہ پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور
 ہو گا۔ عیسائی قوتیں بھی اس کے ساتھ مل جائیں گی اور مسلمانوں کو دوبارہ شدید

ہزیمت و شکست سے دوچار ہونا چاہیے گا اور وہ شدید نقصانات اٹھاتے ہوئے حضرت مہدی کی قیادت میں دمشق کی طرف پیش گئے۔۔۔۔۔ احادیث نبویہ کی رو سے یہ وقت ہو گا عیسیٰ ابن مریم یعنی مسیح علیہ السلام کے آسمان سے نزول کا جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

یہاں تھوڑا سا توقف کر کے اس بات کو سمجھئے کہ احادیث کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے کیسے کیسے سخت مراحل اور صبر آزما امتحانات آنے والے ہیں۔ اور ان کے جلو میں جاہلی ہلاکت اور خون ریزی کے کیسے کیسے طوفان اٹھنے والے ہیں۔ ہمیں بالعموم یہ کہہ کر چھٹی اور لوری دے دی جاتی ہے کہ بس اب پندرہویں صدی غلبہ اسلام کی صدی ہے اور روشن مستقبل ہمارا اٹھ رہا ہے ہم خوش ہو جاتے ہیں اور ان "امانی" سے بہل جاتے ہیں اور ہمیں ان فرائض کا احساس نہیں ہوتا جو احلئے کلمۃ اللہ، احقاق حق، ابطال باطل، اور غلبہ دین متین کی سعی و جہد کے ضمن میں ہر کلمہ گو کے ذمے ہیں۔ حالانکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کن انتہائی کٹھن مراحل سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور قطرے کے گم ہونے تک اس پر کیا کچھ بیٹنے والی ہے اور ان امتحانوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لئے ہمیں حقیقی ایمان کی کتنی ضرورت ہے۔ مشرق وسطیٰ میں سلطنت اسرائیل کے قیام اور دنیا بھر سے لاتعداد یہودیوں کی وہاں منتقلی، پھر ان ممالک کی طرف سے جو عظیم اکثریت کے لحاظ سے عقیدہ عیسائی ہیں "اسرائیل" کی سرپرستی اور معاونت اور اس کی جارحانہ اور توسیع پسندانہ پالیسی کو پیش نظر رکھئے اور غور کیجئے کہ مستقبل میں کون کون سے علاقے مجاز جنگ بننے والے ہیں۔

بہر حال صحاح ستہ جیسی بلند پایہ کتب احادیث کے علاوہ دوسرے بہت سے مجموعوں کے ذریعے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں، ان میں قطعیت اور صراحت کے ساتھ دجال اکبر کے ظہور اور حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی سال و سن اور صدی کے تعین کے بغیر خبریں دی گئی ہیں۔ ان احادیث مجملہ کی روشنی میں ہمارا اس بات پر کامل ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم بنفس نفیس آسمان سے

نزول فرمائیں گے۔۔۔۔۔ صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ میں نزول مسیح کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ”ذجال جب مسلمانوں کو پامال کرتا ہوا دمشق کا محاصرہ کر لے گا تو اللہ تعالیٰ مسیحؑ ابن مریمؑ کو بھیج دے گا اور وہ دمشق کے مشرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے، جب وہ سر جھکا کریں گے تو ایسا محسوس ہو گا کہ قطرے نپک رہے ہیں اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے دھلکتے نظر آئیں گے، ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی، اور وہ حدِ نظر تک جائے گی، وہ کافر زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابن مریمؑ ذجال کا پیچھا کریں گے اور لُہ کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔“ ایک اور حدیث میں ذجال کے ظہور کے سلسلہ میں آتا ہے کہ ”پھر عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ذجال کو ایق کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔“ ان احادیث میں ذجال کے قتل کا مقام لُہ اور ایق کی گھاٹی کا قرب بیان کیا گیا ہے تو جان لیجئے کہ لُہ (لُہا) فلسطین میں اسرائیل کے دار السلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہ اسرائیل کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔ ایق آج کل ایق کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شام اور اسرائیل کی سرحد کے قریب شام کا آخری شہر ہے جس سے آگے اسرائیل کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور لُہ کے ہوائی اڈے کی طرف جاتی ہے۔ ان واضح احادیث اور تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اسی مضمون کی بہت سی احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نزول فرمانے والے بغیر نہیں وہی حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام ہوں گے۔ احادیثِ صحیحہ میں یہ وضاحت و صراحت بھی ملتی ہے کہ حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں بحیثیت نبی تشریف نہیں لائیں گے بلکہ اُس وقت ان کی حیثیت خاتم النبیین آخر الرسل جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک امتی کی ہوگی۔ احادیث میں ان کے نزول کا وقت نماز فجر کے قریب بیان ہوا ہے اور یہ بات بھی مذکور ہے کہ ان سے کہا جائے گا کہ آپ آگے بڑھیں اور نماز کی امامت فرمائیے، لیکن آں جناب انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ

تمہارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہئے۔ چنانچہ وہ حضرت مہدیؑ کی اقتداء ہی میں نماز ادا کریں گے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”کیسے ہو گے تم لوگ جبکہ تمہارے وزیر میان ابن مریم اتریں گے اور تمہارا امام اس وقت تم ہی میں سے ہو گا۔ اس مضمون کی بکھڑت احادیث ہیں۔۔۔۔۔ یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ ان کی حیثیت امت محمد علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک امتی کی ہوگی اور امت مسلمہ کا نظم برقرار رہے گا۔

نزول مسیح علیہ السلام کے سلسلے کی جملہ احادیث پر غور و تدبر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے نزول کا اصل مشن دجال کا قتل اور یہود کو کفر کر دار تک پہنچانا ہے۔ چونکہ قرآن حکیم میں رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ جن قوموں کی طرف رسولوں کی بڑا راست بعثت ہوتی ہے وہ اگر بحیثیت مجموعی رسول پر ایمان لانے سے انکار کریں تو ہلاک کر دی جاتی ہیں۔ جیسے قوم نوح، قوم لوط، قوم صالح اور قوم شعیب علیہم السلام پر عذاب استیصال کے نزول اور ان کی ہلاکت و بربادی کا قرآن حکیم میں تفصیل سے متعدد بار ذکر ہے۔ از روئے قرآن مجید حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اصلاً بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۴۹ کے آغاز میں فرمایا ”وَرُسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ“۔۔۔۔۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کو حضرت مسیحؑ کی تکذیب کے جرم کی پاداش میں ہلاک نہیں کیا گیا، ان پر عذاب استیصال نہیں آیا، بلکہ ان کی ہلاکت کا مرحلہ سنت اللہ کے مطابق ابھی آتا ہے۔ اسی سنت اللہ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہو گا جن کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تھا اور ان ہی کے ہاتھوں سے یہود سنت اللہ کے مطابق برباد، ہلاک اور نیست و نابود کر دیئے جائیں گے اور ان کا باطلیہ استیصال ہو گا۔ یہودیوں کے استیصال کے ساتھ ساتھ نزول مسیحؑ کے بعد عیسائیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور تمام عیسائی حلقہ گوش اسلام ہو جائیں گے اور تمام دنیا پر دین الحق کی حکمرانی ہوگی اور اس طرح ”لَبِطْطِيرُهُ عَلَى الدِّينِ مُحَمَّدِيَّةٌ“ کی

شان بکمال و تمام سارے عالم پر ظاہر ہو جائے گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے بخاری و مسلم اور ترمذی و مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اتریں گے تمہارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ دیں گے (فیکسر الصلیب) اور خنزیر کو ہلاک کریں گے (و یقتل الخنزیر) اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے۔ دوسری روایت میں جزیے کا لفظ ہے۔ یعنی جزیہ ختم کر دیں گے (و یضع الحرب او یضع الجزیة) اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور ایک سجدہ کر لیا دنیا و دنیا میں سے بہتر ہوگا۔“ تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اس مضمون کی متعدد احادیث صحیح سند کے ساتھ مختلف صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں۔ ان تمام احادیث میں ”یکسر الصلیب“ اور ”یقتل الخنزیر“ اور ”یضع الجزیة“ کے جو الفاظ آئے ہیں اس کا مفہوم تھوڑے سے غور و فکر سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ صلیب کو توڑنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت ایک الگ مذہب کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔۔۔۔ حضرت مسیحؑ اپنے نزول کے بعد خود اعلان فرمائیں گے کہ میں خدا کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا بندہ ہوں ”اِنِّی عَبْدُ اللّٰہِ۔۔۔“ نہ ہی مجھے صلیب پر چڑھایا گیا تھا بلکہ مجھے میرے رب نے آسمان پر زندہ اٹھالیا تھا۔ نہ میں نے خنزیر کو حلال کیا تھا اور نہ ہی میں نے شریعت کو ساقط کیا تھا اور ساتھ ہی وہ نبی اکرم ﷺ کی تصدیق فرمائیں گے۔ نتیجہ عیسائیت ختم ہو جائے گی اور ”یضع الجزیة“ یعنی جنگ یا جزیہ کو ختم کر دینے کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزول مسیحؑ کے بعد امتوں کا اختلاف ختم ہو جائے گا دوسرے تمام مذاہب و ادیان بھی مٹ جائیں گے اور سب لوگ ملت اسلام میں شامل ہو کر ایک امت واحدہ بن جائیں گے۔ اس طرح نہ جنگ و قتال کی ضرورت باقی رہے گی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا پورے کرہ ارض پر اللہ کا دین غالب ہو جائے گا اور الصالح الصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق آسمان سے رحمتیں

نازل ہوں گی اور زمین اپنے تمام پوشیدہ خزانے اور برکتیں اگل دے گی۔
متعدد احادیث کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ
علیہ السلام فتنہ و جال کے فرو کرنے، یہودیوں کا استیصال کرنے، تمام باطل ادیان
کو محو اور تمام ملل و اہم کو ملت محمدی علی صاحبنا الصلوٰۃ والسلام میں ضم کرنے کے
بعد چالیس سال تک اس دنیا میں رہیں گے۔ چنانچہ مسند احمد میں ایک روایت
آتی ہے جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جال کے قصے میں
بیان کرتی ہیں کہ ”پھر عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور و جال کو قتل کریں گے۔
اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک امام عادل اور حاکم
منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔“ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے
کہ ان کی شادی بھی ہوگی، وہ صاحب اولاد ہوں گے، پھر ان کا انتقال ہوگا اور وہ
”مُحِلُّ نَفْسِ ذَا اِيْقَةِ الْمَوْتِ“ کے اہل قانونِ قدرت سے دو چار ہوں گے
یعنی ان پر بھی طبعی موت واقع ہوگی جیسے ہر ذی نفس پر واقع ہوتی ہے۔ پھر ان کی
تدفین بھی اس حجرہ شریف میں ہوگی جس میں نبی اکرم ﷺ اور حضورؑ کے دو
جلِ ثار ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ مدفون ہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ احادیثِ نبویہؐ میں قرب قیامت کے متعلق جو
علامات اور پیشین گوئیاں بیان ہوئی ہیں وہ ظاہر ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ گویا آخری
سین کے لئے اسلحہ تیار ہو رہا ہے۔ یہودی جو دنیا کے مختلف ممالک میں منتشر تھے
ان کی اسرائیل کے نام سے فلسطین میں ایک آزاد و خود مختار ریاست آج سے
تقریباً تینتیس سال قبل قائم ہو چکی ہے (اب اسرائیل کے قیام پر یہ تینتیس سال
بیت چکے ہیں)۔ جہاں تمام دنیا سے سمٹ سمٹ کر یہودی جمع ہو رہے ہیں۔ ان کا
سربراہ، ان کی قابلیت، ذہانت اور مہارت مجتمع ہو کر عالم اسلام کے لئے ایک خطرہ
بن چکی ہے۔ اس خطرے کا عملی مظاہرہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ہو چکا ہے جس کے
نتیجے میں شام، اردن، لبنان اور مصر کے بہت سے علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ ہوا
جو آج تک برقرار ہے۔ سب سے بڑھ کہ یہ کہ بیت المقدس پر بھی وہ قابض
ہے اور اس کی حرمت اس کے ہاتھوں پامال ہو رہی ہے۔ ظہور اسلام کے وقت

میدان جنگ مشرق وسطیٰ ہی ہوگا اور عجب نہیں کہ بیشتر مسلم ممالک خواہی
 نواحی امریکہ اور اس کے یورپی اتحادیوں کے دوش بدوش اس جنگ میں شامل
 ہوں اور دنیا جانتی ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی نوے فیصد سے زیادہ
 آبادی عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ گویا احادیث نبویہ میں جس عظیم جنگ کی خبر دی
 گئی تھی کہ ایک زبردست اور خونریز و تباہ کن جنگ ہوگی جس میں مسلمان اور
 عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے، اس کے آثار سامنے نظر
 آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس متوقع ہولناک تباہی کے ظہور میں آنے میں کچھ
 اور وقت لگے لیکن موجودہ حالات کی سنگین تباہی یہ ہے کہ یہ جنگ اور ٹکراؤ ناگزیر
 اور اٹل ہے۔ یہودی اس جنگ میں یقیناً امریکہ ہی کے حلیف ہوں گے کیونکہ
 امریکہ کی حمایت ہی میں اسی سرطان نے مشرق وسطیٰ میں اپنے نچے گاڑے ہیں
 اور امریکہ ہی اس وقت ان کا سب سے بڑا حامی و مددگار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
 کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے دلوں میں متوقع جنگ کے بعد یہودی ہی نفرت کا
 بیج بونے کا کھدازا داکریں گے اور پھر دجال کی قیادت میں عیسائی مملکتوں کی تائید و
 اعانت حاصل کر کے مسلمانوں پر یلغار کریں گے اور مسلمان شکست و ہزیمت
 سے دوچار ہوں گے۔ یہی وقت ہوگا حضرت مسیحؑ کے نزول کا اور یہی دور ہوگا
 جب یہودیت کا باطلہ استیصال ہوگا اور عیسائی دین اسلام میں داخل ہو جائیں گے
 اور ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور اللہ ہی کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے
 گا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ امن و سلامتی کا دور کتنے سال اور کتنی صدیوں تک
 رہے گا لیکن بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انسانیت
 کا قافلہ پھر صراطِ مستقیم اور جاہِ حق سے ہٹ کر شیطان کی تباہی ہوئی پگڑتلیوں
 میں بھٹک جائے گا حتیٰ کہ زمین اللہ تعالیٰ سے بغاوت و سرکشی کی وجہ سے ظلم
 و ستم اور جور و تعدی سے معمور ہو جائے گی۔ شرعاً غلبہ ہوگا اور خیر مغلوب ہی
 نہیں، ناپید اور معدوم ہو جائے گا۔ یہ زوال دنیا کا خاتمہ لے کر آئے گا اور وہ
 ساعت جس کو ہم قیامت کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کی خبر قرآن مجید
 میں مختلف اسالیب سے دی گئی ہے، آئے گی اور یہ دنیا تہہ و بالا اور ملیا میٹ کردی

جائے گی۔ نظامِ فقل درہم برہم ہو جائے گا اس وسیع و عریض کائنات میں پھیلے ہوئے عظیم الشان ستارے اور کمرے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور یہ عالم تیس تیس ہو جائے گا۔

حاصلِ کلام یہ کہ یہ کائنات مشیت و حکمتِ خداوندی کے تحت اپنی اجلِ مسٹی یعنی قیامت کی طرف گامزن ہے اور اس انجام سے لازماً دوچار ہوگی جو اس کا مقدر ہے لیکن اس انجام کے وقت ’سل‘ سن یا صدی کا تعین کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے جیسا کہ سورہ لقمان کی آخری آیت اور حدیثِ جبریلؑ سے صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔ البتہ یہ گھڑی اگر رہے گی اس میں شک کرنا کفر ہے۔ پھر اس آخری گھڑی کے آنے تک امتِ مسلمہ اور بنی نوع انسان جن حالات سے دوچار ہوں گے اس کا جو نقشہ احادیثِ نبویہؐ سے سامنے آتا ہے اس کو بھی میں نے بیان کر دیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ قرآن و حدیث میں کسی صدی کے تعین کے ساتھ کوئی خبر نہیں دی گئی ہے، لیکن احادیث میں جو علامات بیان ہوئی ہیں وہ ہم کو چشمِ سر سے نظر آ رہی ہیں اور صاف نظر آرہا ہے کہ ہمیں بہت کٹھن مراحل اور سخت احتمالات سے گزرنا ہے اور یہ محض خام خیالی ہے کہ چند ہویں صدی از خود ہمارے لئے غلبہٴ اسلام کی نوید لیکر آ رہی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی امتِ مسلمہ کو کن کن صدموں اور حادثوں سے دوچار ہونا ہے البتہ اس میں شک نہیں کہ ایک دور لازماً آئے گا جس میں اسلام کا غلبہ ہوگا۔۔۔۔۔۔ بڑے فیصیے والے ہوں گے وہ لوگ جو اس غلبہٴ اسلام میں حضرت مہدیؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے زیرِ قیادت فی سبیل اللہ اور غلبہٴ دین حق کے لئے جہاد و قتال میں اپنے جان و مال کی قربانیاں پیش کریں گے اور بڑے ہی خوش نصیب ہوں گے جو غلبہٴ اسلام کے اس دور کا نظارہ بھی سر کی آنکھوں سے کریں گے اور اس کی سعادتوں سے مستفیض اور مستفیض بھی ہوں گے!

(نوٹ: یہاں اب سے بارہ سال قبل کی گذارشات اختتام کو پہنچیں!)

دو شبہات اور ان کے جواب

ان صفحات میں جو بحث چل رہی ہے اس کے ضمن میں جو مسائل زیر بحث آرہے ہیں ان کے بارے میں میں اپنی یہ تشویش بیان کر چکا ہوں کہ ان سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ قطعاً ”الرجل“ ہے اور ان پر بحث و گفتگو کو ضعیف الاعتقادی کا مظہر اور وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔ اس سے قبل یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ فتنہ انگار سنت اور استخفاف حدیث کے زیر اثر نہ صرف جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد بلکہ بہت سے نوجوان ”علماء“ بھی ان مسائل سے ”غفلت بھر“ اور صرف نظری کو مناسب خیال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان موضوعات پر گفتگو کے سلسلے میں راقم کو کچھ اور ”اندیشے“ بھی تھے کہ اس گفتگو سے کوئی مفی تاثرات نہ لے لئے جائیں!

چنانچہ حال ہی میں راقم کو اپنی متذکرہ بالا تشویش اور اندیشوں کے دو شاہد موصول ہوئے۔ چنانچہ ایک تو خط ہے جو نیویارک سے موصول ہوا۔ مراسلہ نگار پروفیسر میاں ابراہیم ہیں (۲۸۸ - ایسٹ سٹریٹ ۸، بروکلن، نیویارک - ۱۱۲۱۸) اور اس کے آغاز اور اختتام کے یہ جملے پورے کتب کا حاصل اور لب لباب ہیں: ”امید ہے کہ مزاج خوشگوار ہوں گے۔ روزنامہ نوائے وقت میں آپ کے مضامین ابراہیمی مذہب کا ثالث ثلاثہ اور آنے والے دور کی واضح تصویر کا مطالعہ کیا۔ آپ نے تحریر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے..... ان مضامین کے لکھنے سے آپ کا مقصد جو کچھ بھی ہو، آپ ہی بہتر جانتے ہیں، لیکن قاری صرف یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ آپ مسلمانوں خصوصاً بوسنیا اور مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو بشارت دے رہے ہیں کہ

ظلم و ستم کا ہر وار نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ شکر الحمد للہ پڑھ کر برداشت کئے جاؤ۔
قیامت سے قبل ابن مریمؑ تشریف لائیں گے اور ظالموں سے انتقام لے لیں گے!“
دوسرا حق رِوَع عمل ”بالشفافہ“ موصول ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ ملتان سے دونوں جوان
علماء نے شدّ رحال فرما کر لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا کی تاکہ مجھے ”مطلع“ کریں کہ
میری ان تحریروں سے یہ تاثر عام ہو رہا ہے کہ میں خود ”مہدی موعود“ ہونے کا دعویٰ
کرنے والا ہوں۔ لہذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل کچھ وضاحتیں ان
دو امور کے بارے میں پیش کر دی جائیں۔

ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر بات کا تعلق ہے اگرچہ اس پر صرف ”انا اللہ و
انا الیہ راجعون“ پڑھ دینا بھی کافی ہے۔ تاہم شاید اس پر مستزاد یہ وضاحت مفید ہو کہ
جن احادیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ جب مسلمانانِ عرب پر شدید مصائب کا دور آئے گا
اللہ تعالیٰ انہیں ایک مومن و متقی اور باہمت و باصلاحیت قائد عطا فرمائے گا جو دشمنوں کے
مقابلے میں ان کی سپہ سالاری کے فرائض باحسن وجہ سرانجام دے گا، ان ہی میں سے
صراحت بھی موجود ہے کہ وہ قائد موعود نبی اکرم ﷺ کی عمرت یعنی حضرت فاطمہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد میں سے ہو گا۔ جبکہ میں تو اپنے بارے میں اب سے چھ سات
سال قبل اپنی تالیف ”استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ“ (صفحات ۱۰۹-۱۱۲) میں صراحت کر
چکا ہوں کہ اگرچہ میری والدہ مرحومہ صدیقی یعنی حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل
سے تھیں، لیکن میرا دھیال خالص ہندی الاصل ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے بارے میں
علامہ اقبال کا وہ شعر بھی نقل کیا تھا جو انہوں نے ”ایک فلسفہ زدہ سید زادے“ سے خطاب
کرتے ہوئے کہا تھا۔۔۔۔۔ یعنی :-

میں اصل کا خاص سوماتی
آباء مرے لاتی و مناتی

لہذا میرے لئے تو یہ دروازہ بند ہے ہی، میرے نزدیک تو آج تک جس ”غیر فاطمی“ نے
کبھی مہدی موعود ہونے کے خواب دیکھے یا دعویٰ کیا وہ صریح تضاد کا شکار ہوا کہ اس نے

حضرت مہدی کی بشارت تو احادیثِ نبویؐ سے افذ کی، لیکن ان کے خصائص اور حسب نسب کی ان تفصیل کو سرے سے نظر انداز کر دیا جو خود ان احادیث ہی میں وارد ہوئی ہیں۔ رہا عقل و منطق کا معاملہ تو حضرت مہدی کے بارے میں جو خیالات اہل سنت کے ہیں کم از کم ان میں تو کوئی بات نہ عقل کے نزدیک محال ہے، نہ عام قوانینِ طبعی کے خلاف، بلکہ اس قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے کہ جب فتنہ و فساد حد سے بڑھ جاتا ہے تو بالآخر وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ۔

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ رہتا ہے کوئی موسیٰؑ، تسلیم سامری!
اس لئے کہ اگر خونِ اسرائیل میں اتنی حرارت تھی تو خونِ اسماعیلؑ اُتتا سرور اور عترت محمد ﷺ اتنی بانجھ کیوں ہو جائے گی کہ عظیم فتنہ و فساد کے وقت کوئی ہادی و مہدی پیدا نہ کر سکے!

بہر حال، راقم کے نزدیک تو ایمان بالرسالت کا تقاضا یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ میں وارد شدہ تمام خبروں کو تسلیم کیا جائے خواہ وہ عام عقلِ انسانی اور اب تک کے دریافت شدہ قوانینِ طبعی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، لہذا حضرت مہدی کے بارے میں کسی شک یا شبہ کا کیا سوال جبکہ ان کے ضمن میں تو کوئی خلاف عقل یا مخالف قوانینِ طبعی بات کم از کم احادیثِ نبویہؐ میں موجود نہیں ہے۔ تاہم حضرت مہدی کے معاملے میں راقم کی اصل دلچسپی اس حدیث کی بناء پر ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ بلادِ مشرق سے ان کی مدد کے لئے فوجیں جائیں گی۔ (”بخرج ناس من المشرق یوطون للمہدی یعنی سلطانہ“ رواہ ابن ماجہ عن عبد اللہ ابن العمارثؓ)۔ تو کاش کہ راقم اور اس کے ساتھی اور جمیع مسلمانانِ پاکستان اپنا تن من دھن اس ارضِ پاکستان میں جو بلادِ عرب کے مشرق میں واقع ہے اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کھپادیں، تاکہ نہ صرف اس سر زمین میں جہاں سے ”میرِ عرب“ ﷺ کو بقول اقبال ٹھنڈی ہوا آئی تھی، خلافتِ علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہو جائے بلکہ پھر ہمیں سے مسلمانانِ عرب کی مدد کا

سلمان فراہم ہو سکے۔۔۔۔۔ اور اس طرح اگر ہماری مساعی ان لشکروں کا راستہ صاف کرنے میں کام آجائیں جو حضرت ہندی کی مدد کے لئے جائیں گے تو ہماری سعادت اور فوز و نجات کے لئے یہی کافی ہے۔۔۔۔۔ اور جیسا کہ بعد میں تفصیل سے واضح کیا جائے گا اسرائیل کے وجود میں آنے سے ایک سال قبل پاکستان کا خالص معجزانہ طور پر قیام مشیتِ ایزدی میں یقیناً اسی کی تہید ہے۔۔۔۔۔!!

جہاں تک پہلے منفی تاثر کا تعلق ہے تو مختصر ترین الفاظ میں گزارش ہے کہ پیشگوئیاں صرف اصولی و نبوی ہی میں بیان نہیں ہوئیں خود قرآن میں بھی وارد ہوئی ہیں۔ لیکن ان سے وہ مطلب نکالنا جو پروفیسر ابراہیم صاحب نے نکالا ہے کسی طرح درست نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی اہم ترین اور نمایاں ترین پیشگوئی وہ تھی جو سورۃ الروم کے آغاز میں وارد ہوئی۔ یعنی:

غُلِبَتِ الرُّومُ ۝ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلِبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ ۝ فِي ضَرْبِ سِنِينَ ۝ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ ۝ وَيَوْمَئِذٍ يَفْعَرُ الْمُكُفُّونُ ۝ يَنْصُرُ اللَّهُ يَنْصُرُ مَن يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝
”قرب کی سر زمین (یعنی شام) میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں کے اندر اندر دوبارہ غالب آجائیں گے۔ اللہ ہی کے اختیار میں ہے کل معاملہ پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور اس روز اہل ایمان بھی اللہ تعالیٰ کی مدد کے طفیل فرحان و شادمان ہوں گے۔ اللہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ اور وہ زبردست اور رحیم فرمانے والا ہے!“

(آیات ۲ تا ۵، زمانہ نزول لگ بھگ ۶۱۳ء)

چنانچہ یہ اعجازِ قرآنی کا بہت عظیم مظہر ہے کہ نویں سال بعد یعنی ۶۱۳ء میں ایک جانب قیصرِ روم ہرقل کو ایرانیوں پر فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور دوسری جانب اہل ایمان کو بھی بدر میں کفارِ مکہ پر عظیم فتح حاصل ہوئی اور اس طرح یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہو گئی۔ لیکن ذرا پروفیسر ابراہیم صاحب غور فرمائیں کہ کیا آج سے چودہ سو سال قبل بھی کسی شخص نے قرآن کی ان آیات سے یہ مطلب نکالا ہو گا کہ ان کے ذریعے قرآن ایک جانب

رومیوں کو یہ درس دے رہا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، بلکہ ایرانیوں کی خدمت میں دست بستہ ”سر تسلیم خم“ کئے رکھو۔ اور دوسری جانب اہل ایمان کو بھی یہ نصیحت کر رہا ہے کہ کفر اور اہل کفر کے مقابلے کی کوئی سہی کرو، نہ جانفشانی اور سرفروشی سے کام لو بلکہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہو اور صرف اللہ کی مدد کا انتظار کرتے رہو؟ اور اگر بفرض محال کسی نے ان آیات مبارکہ سے یہ مطلب اخذ کیا ہو تو کیا اس کا کوئی الزام قرآن پر آئے گا؟

اسی طرح اگر نبی اکرم ﷺ نے مکی دور کے بھی آغاز ہی میں یہ ”خوش خبری“ دے دی تھی کہ اے مسلمانو! عنقریب قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں تلے ہوں گے، تو کیا اس سے مراد یہ تھی کہ تم آرام سے گھروں میں بیٹھے رہو، یہ انقلاب عظیم از خود اور خود بخود رونما ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اس ”پیشینگوئی“ سے یہ مطلب اخذ کرنا نہ اُس وقت درست تھا نہ آج درست ہے!

کاش کہ پروفیسر ابراہیم صاحب اور ان کی طرز پر سوچنے والے تمام حضرات کو معلوم ہو کہ ”میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو“ کے مصداق راقم کی تو پوری زندگی کی سعی و جد کا مرکزی نقطہ ہی یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو

”خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!“

کے مصداق اپنی حالت بدلنے پر آمادہ کرے۔ لیکن اس کے لئے ظاہر ہے کہ یہ لازم ہے کہ موجودہ حالات کا صحیح اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور ملت کے امراض کی صحیح تشخیص کی جائے تاکہ صحیح اور مفید و موثر علاج تجویز کیا جاسکے۔ اور ایسا نہ ہو کہ پوری توجہ کو صرف ظاہری علامات ہی کے ازالے پر صرف کر کے قیمتی وقت ضائع کر دیا جائے اور اس طرح مملت اصلاح ختم ہو جائے اور بالآخر سوائے ناکامی و نامرادی کے کچھ ہاتھ نہ آسکے۔ چنانچہ جس طرح کبھی علامہ اقبال نے فرمایا تھا:-

خوار از مجبورۃ قرآن شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

اور

اے چوں شبنم بر زمیں افتدہ
در بغل داری کتابِ زندہ

یعنی ”اے امتِ مسلمہ! تو ذلیل و خوار تو اس سبب سے ہوئی ہے کہ تو نے قرآن سے منہ موڑ لیا ہے، لیکن تو شکوہ گردشِ دوراں کا کر رہی ہے!“ اور ”اے وہ قوم! جو شبنم کے مانند زمین پر پڑی ہوئی ہے (اور دشمن اسے پاؤں تلے روند رہے ہیں!) تیری بغل میں وہ کتابِ زندہ موجود ہے (جو تجھے اس ذلت و رسوائی سے رستگاری عطا کر سکتی ہے!)۔۔۔ اسی طرح ان گزارشات کے ذریعے امتِ مسلمہ کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرنا مقصود ہے کہ ہم اس وقت در حقیقت اس جرم کی پاداش میں عذابِ الہی میں گرفتار ہیں کہ ہم دنیا میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نمائندے اور اس کے دینِ حق کے علمبردار ہونے کے مدعی ہو کر اپنے عمل کے ذریعے ان سب کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اور

”فلک کا جو مسلسل جواب دے اس کا ہم اپنے حال میں کب انقلاب دیکھیں گے؟“

کے سوال کا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ اس عذابِ الہی سے نجات کے حصول کا راستہ صرف یہ ہے کہ ہم ابتدائے کم از کم کسی ایک خطہٴ ارضی میں اللہ کے کامل دینِ حق اور اس کے معتدل اور متوازن نظامِ عدلِ اجتماعی کو بلا کم و کاست قائم کر کے اللہ کی نمائندگی کا حق ادا کر دیں اور اس طرح شلواتِ علی الناس کی اس ذمہ داری سے عمدہ بر آہوں جس کے لئے ہمیں بحیثیت امت برپا کیا گیا تھا۔ اور ”گریہ نہیں تو بلایا پھر سب کمائیاں ہیں!“ کے مصداق اگر ہم اس بنیادی جرم سے باز نہیں آتے اور اس اصل کوتاہی کی تلافی نہیں کرتے تو نہ امریکہ کی کلمہ لیس ہمارے امراض کا ازالہ کر سکتی ہے نہ کوریا کی فٹالی ہماری ترقی اور استحکام کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اس لئے کہ

”اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
 خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی“
 کے مطابق امتِ مسلمہ کا معاملہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح نہیں بلکہ ہر اعتبار سے
 منفرد اور مختلف ہے!

اب اس سے پہلے کہ کتبِ حدیث کے ”ابوابِ ملاحم“ یعنی تاریخ انسانی کے آخری
 دور میں پیش آنے والی عظیم اور تباہ کن جنگوں کے سلسلے کے تذکرہ پر مشتمل ابواب کی
 چند اہم احادیث اور ان میں سے خاص طور پر ایسی احادیث کا تذکرہ کیا جائے جن میں وارد
 شدہ پیشینگوئیوں کا عالم واقعہ میں ظہور بالکل ایسے انداز میں شروع ہو چکا ہے جیسے صبح
 طلوع ہوتی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ عالمِ مادی میں وہ عظیم
 جنگیں جن اسباب کی بناء پر ظہور میں آئیں گی ان سے قطع نظر مشیتِ ایزدی میں ان کی
 غرض و غایت کیا ہوگی؟

یہ بات ان احادیث سے تو صراحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہی ہے کہ ان جنگوں کا
 میدان مشرقِ وسطیٰ بنے گا، عالمی حالات اور واقعات بھی ایک عرصہ سے اسی جانب اشارہ
 کر رہے ہیں کہ آئندہ جنگِ عظیم یعنی اس صدی کی تیسری عالمگیر جنگ یورپ میں نہیں،
 مشرقِ وسطیٰ میں لڑی جائے گی۔ اس لئے بھی کہ یورپ دو عالمگیر جنگوں کی تباہی برداشت
 کر کے اب اتنا ”سمجھدار“ ہو گیا ہے کہ تیسری جنگ کا میدان اپنے علاقے کو نہیں بنے
 دے گا۔ اور اس لئے بھی کہ عہدِ حاضر کی سب سے زیادہ قیمتی متاع یعنی تیل کے عظیم
 ترین ذخائر اسی علاقے میں ہیں جسے بجا طور پر سیال سونا کہا جاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس علاقے میں موجود امتِ مسلمہ یعنی امتِ محمدیہ ﷺ کا افضل
 تر حصہ یعنی ”مُتَمِین“ یا عربِ مسلمان تو چودہ سو برس سے آباد ہیں ہی، اس صدی کے
 آغاز سے سابقہ اور معزول شدہ امتِ مسلمہ یعنی یہودیوں کی بھی از سر نو آباد کاری زور
 شور کے ساتھ شروع ہو گئی تھی، جو عنقریب اپنے کلائمیکس کو پہنچ جائے گی اور پوری دنیا
 سے تمام یہودی کشاں کشاں ہمیں آکر آباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ ان عظیم جنگوں یا سلسلہ

لاحم کے ذریعے ہولناک تباہی کی صورت میں اللہ کے قانونِ عذاب کے مطابق شدید ترین کوڑے ان ہی دونوں پر پڑیں گے۔ لیکن ان کے مابین بالآخر ایک عظیم فرق و تفاوت ظاہر ہوگا۔ یعنی سابقہ معزول، مغضوب، اور ملعون امت یعنی یہود پر تو اللہ کے اس ”عذابِ اکبر“ کے فیصلے کا نفاذ ہوگا جس کی مستحق وہ حضرت مسیحؑ کے کفر اور آنجنابؐ کو اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا دینے کی بناء پر اب سے دو ہزار برس قبل ہو چکی تھی لیکن جس کے نفاذ کو ایک خاص سبب سے مؤخر کر دیا گیا تھا، چنانچہ اب اسے ان ہی حضرت مسیحؑ کے ذریعے اور مسلمانوں کے ہاتھوں نسیا منسیا اور نیست و نابود کر دیا جائے گا، بالکل جیسے حضرات نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ اور شعیب علیہم السلام کی اقوام اور آلِ فرعون اپنی اپنی جانب بھیجے جانے والے رسولوں کی نگاہوں کے سامنے ہلاک کئے گئے تھے۔ لیکن اس کے برعکس چونکہ موجودہ امتِ مسلمہ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی امت ہے اور آنحضرتؐ کے قول کے مطابق خود آخری امت کی حیثیت رکھتی ہے، مزید برآں وہ صرف ایک نسل پر مشتمل نہیں بلکہ ”ملتی میشعل“ امت ہے لہذا اسے اس کے جرائم کے بقدر سزا دینے کے بعد توبہ کی توفیق اور اصلاح کا موقع عنایت کر دیا جائے گا جس سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور دینِ حق کے غلبے کا دورِ ثانی شروع ہوگا جو اس بار پورے عالمِ انسانی اور کل روئے ارضی کو محیط ہوگا، جس کی صریح اور واضح خبریں دی ہیں جناب صادق و مصدق ﷺ نے اور جس کی کوئی ادنیٰ جھلک اور دھندلی تصویر دیکھ لی تھی چودھویں صدی ہجری کے تابعدار اور وژنری علامہ اقبال نے جس پردہ خود بھی حیرت و استعجاب کی تصویر بن کر رہ گئے تھے کہ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

اور۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!
اور یہ غالباً صرف اس افضل ترین امت کے بھی افضل تر حصے کی سزائیں ایک

انگریزی محاورے کے مطابق ”تکلیف پر توہین کے اضافے“ (to add insult to injury) کی غرض سے ہوا ہے کہ ایک مغضوب و ملعون اور ”Condemned“ قوم کو دو ہزار سال تک باقی بھی رکھا گیا اور پھر عارضی طور پر سنبھالا بھی دیا گیا (اگرچہ اس کے لئے یہ مرنے والے مریض کے آخری سنبھالے یا بچنے والی شمع کی آخری بھڑک کی حیثیت رکھتا ہے) تاکہ موجودہ امت مسلمہ کے افضل ترین حصے کو اس کے ہاتھوں پڑا کر گویا وہ صورت پیدا کر دی جائے جو یوپی کے دیہات میں اختیار کی جاتی ہے، یعنی یہ کہ کسی شخص کی سزا میں توہین و تذلیل کا عنصر شامل کرنے کے لئے اسے کسی جہاز کے ہاتھوں جوتے لگوائے جاتے ہیں۔

واللہ اعلم!

۱۵ جون ۱۹۹۳ء

خلج کی جنگ: ”جنگوں کی ماں“

آج سب سے پہلے تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ گزشتہ جمعہ کے کالم میں حضرت مہدی کے نام کے ساتھ ہر جگہ ”علیہ السلام“ کی مخفف علامت ”ؑ“ درج ہوئی ہے۔ یہ اوارۃ نوائے وقت کے کسی کارکن کے حسن عقیدت کی مظہر ہے جو میرے مسودے میں موجود نہیں تھی۔ میرے نزدیک اگرچہ خالص لغوی اور لفظی اعتبار سے تو جب ہم مسلمان ایک دوسرے سے ملاقات کے موقع پر ”السلام علیکم“ کہتے ہیں تو یقیناً کسی زندہ یا فوت شدہ مسلمان کے لئے ”علیہ السلام“ کے الفاظ بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چونکہ قرآن حکیم میں اہل ایمان سے خطاب کر کے کنا گیا ہے: ”هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَیْكُمْ“ (الاحزاب: ۴۳) یعنی اے اہل ایمان! ”اللہ تم پر اپنی رحمتیں نازل فرماتا رہتا ہے“ تو اس پر قیاس کرتے ہوئے کسی بھی حاضر و موجود مسلمان سے ”صَلَّى اللہ عَلَیْکَ“ اور فوت شدہ یا غیر موجود مسلمان کے لئے ”صَلَّى اللہ عَلَیْہِ“ کے دعائیہ الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن امت کے تعامل یا دستور اور روایت کے تحت ”صلی اللہ علیہ وسلم“ کے الفاظ صرف نبی اکرم ﷺ کے لئے ”علیہ السلام“ بقیہ جملہ انبیاء اور رسولوں کے لئے ”رضی اللہ عنہ“ صحابہ کے لئے ”رحمۃ اللہ علیہ“ بقیہ جملہ بزرگان دین اور ائمہ علم و ہدایت کے لئے ”اور“ ”مرحوم“ عام مسلمانوں کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں۔ اور ان کے استعمال کے معاملے میں ”اگر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی!“ کے پیش نظر احتیاط لازمی ہے۔ اس معاملے میں اہل تشیع کا اپنا جداگانہ معمول ہے جو ان کے عقائد پر مبنی ہے۔ وہ چونکہ اہل بیت کو ”معصوم“ قرار دیتے ہیں جس کے نتیجے میں

ان کا رتبہ انبیاء کرام سے بہت قریب ہو جاتا ہے، لہذا وہ ان کے لئے ”علیہ السلام“ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے نزدیک ”مہدی موعود“ سے مراد ان کے بارہویں امام یعنی حضرت حسن عسکریؑ کے صاحبزادے محمد المہدیؑ ہیں جن کی ولادت تیسری صدی ہجری میں ہوئی تھی اور جو ان کے قول کے مطابق اُس وقت سے تاحال روپوش (غائب) ہیں اور قیامت کے قریب ”ظاہر“ ہوں گے لہذا وہ ان کے نام کے ساتھ ”علیہ السلام“ لکھتے ہیں۔ جبکہ اہل سنت کے نزدیک حضرت مہدی اگرچہ ہوں گے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہی میں سے، لیکن ان کی پیدائش قیامت کے قریب عام انسانوں کی طرح عبد اللہ نامی شخص کے گھر میں ہوگی اور وہ سلسلہ ”ملاحم“ کے پر آشوب دور میں مسلمانانِ عرب کی رہنمائی اور سپہ سالاری کے فرائض سرانجام دیں گے۔

اور اب آئیے اصل مضمون کے طرف۔ اس دنیا کے خاتمے سے قبل عالمی غلبہ اسلام اور پورے کرۂ ارضی پر خلافت علی منہاج النبوت کے قیام کو میں نصوصِ شریعہ میں سے قرآن حکیم سے دلالتِ نص کی بنیاد پر، اور احادیثِ نبویہؐ سے صراحتِ نص کی اساس پر ثابت کر چکا ہوں، مزید برآں علامہ اقبال کے ”وژن“ کے علاوہ اس کی عقلی اور سائنسی دلیل بھی علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کے سب سے بڑے شارح اور اقبال اکیڈمی کے اولین ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے نظریہ ارتقاء سے استشاد کے حوالے سے بیان ہو چکی ہے۔ رہا ان عظیم واقعات و حوادث کا معاملہ جن کی خبریں اس سے متصلاً قبل کے دور کے ضمن میں احادیثِ نبویہؐ میں وارد ہوئی ہیں تو ان میں سے بھی سوائے ایک یعنی نزولِ مسیحؑ کے اور کوئی بات نہ خلافِ عقل و قیاس ہے نہ مخالفِ قوانینِ طبعی۔

چنانچہ جب اس بیسویں صدی عیسوی کے دوران اس سے قبل دو عظیم جنگیں ایسی واقع ہو چکی ہیں جن کا سلسلہ کئی کئی سال تک جاری رہا، اور جن سے بڑے بڑے ملک بھی تہس نہس ہوئے اور کروڑوں کی تعداد میں انسان بھی قتل یا معذور ہوئے، تو کونسی قابلِ تعجب اور خلافِ عقل بات ہوگی اگر ایک تیسری عظیم جنگ بھی واقع ہو جس کا میدان

مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں، اور اس کا سلسلہ بھی کئی سالوں کو محیط اور کئی ادوار پر مشتمل ہو، اور اس کے نتیجے میں جہاں عظیم تعداد میں عرب مسلمان بھی قتل ہوں، وہاں ان یہودیوں کا تو بالکل ہی قلع قمع ہو جائے جو دنیا کے کونے کونے سے وہاں آکر آباد ہو رہے ہیں۔

اسی طرح تاریخ انسانی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ جب کسی قوم یا ملک کے حالات انتہائی ابتر ہو جاتے ہیں تو۔

”خون اسرائیل“ آ جاتا ہے آخر جوش میں

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ“ طلسم سامری!“

کے مصداق بظاہر مردہ اور ازکار رفتہ قوم میں سے بھی دفعۃً کوئی عظیم شخصیت ایسی ابھر آتی ہے جو قوم کے تین مردہ میں نئی روح پھونک دیتی ہے اور صر ”لڑا دے مولے کو شہباز سے!“ کے مصداق نحیف و ناتواں اور کم ہمت اور بے حوصلہ لوگوں کو بھی عظیم قوتوں سے مقابلے کے لئے کھڑا کر دیتی ہے۔ تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں ”خون اسماعیل“ بھی جوش میں آجائے اور۔

”کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے

یہ شلخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگِ درِ پیدا!“

کے مطابق اولادِ فاطمہؑ کی شلخ پر کوئی گلِ سرسبد کھل اٹھے؟

تاہم آج سے ساڑھے بارہ سال قبل جب میں نے پندرہویں صدی ہجری کے متوقع حوادث و واقعات کے موضوع پر تقریر کی تھی تو خود مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ ان کا سلسلہ اس قدر جلد شروع ہو جانے والا ہے۔ مزید برآں جس حدیثِ نبویؐ کی بنیاد پر میں نے یہ بات کہی تھی کہ قیامت کے قریب پیش آنے والی عظیم جنگوں کا پہلا دور اس طور سے شروع ہو گا کہ مسلمان اور عیسائی متحد ہو کر کسی تیسری قوت کے خلاف جنگ کریں گے جس میں انہیں فتح حاصل ہوگی، وہ سنن ابی داؤدؒ کی کتاب الملاحم میں حضرت ذوالحجہؒ سے مروی ہے اور اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: ”عنقریب تم رومیوں (یعنی عیسائیوں) سے

بھرپور صلح کرو گے اور پھر وہ اور تم متحد ہو کر ایک ایسے دشمن کے خلاف جنگ کرو گے جو تمہارے عقب میں واقع ہو گا۔ پھر تمہاری مدد ہو گی، چنانچہ تم غنیمت حاصل کرو گے اور خود سلامت رہو گے!“ اور اُس وقت گمان غالب یہ تھا کہ اس جنگ میں ایک جانب امریکہ کی سربراہی میں یورپ کی جملہ عیسائی حکومتیں اور اکثر مسلمان ملک خصوصاً عرب حکومتیں ہوں گی اور دوسری جانب روس اور اس کے طفلی ممالک ہوں گے۔ اور اُس وقت یہ خیال تک نہ ہو سکتا تھا کہ اس وقت سوویت یونین تو ”سُورِی“ ہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری!“ کا نقشہ پیش کر رہی ہو گی اور وہ تیسری طاقت عین جزیرہ نمائے عرب کے ”عقب“ میں واقع ہو گی یعنی صدام حسین کی سربراہی میں عراق کی بعثی حکومت! حالانکہ نہایت مستند احادیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ عراق میں سونے کا خزانہ یا پہاڑ برآمد ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہاں نہایت خوں ریز اور خوفناک جنگ ہو گی، لیکن چونکہ ان احادیث کے متن میں کوئی لفظی تعلق قیامت سے قبل کے سلسلہ ملائم کے ساتھ موجود نہیں ہے لہذا ان میں وارد خبر کو ایک جداگانہ اور مستقل بلاذات معاملہ سمجھا گیا۔ لیکن اب جبکہ الفاظ قرآنی ”اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ“ کے مصداق وہ واقعہ ظہور پذیر ہو چکا ہے ان احادیثِ نبویہؐ کی عظمت بھی اظہر من الشمس ہو گئی ہے کہ: (۱) صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد ہو جائے گا!“ اور (۲) صحیح مسلمؒ میں حضرت ابی ابن کعبؓ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد ہو جائے گا۔ تو جب لوگ اس کے بارے میں سنیں گے تو اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تو جو لوگ اس کے پاس ہوں گے وہ سوچیں گے کہ اگر ہم نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ ساری دولت لے جائیں گے۔ پھر اس پر جنگ کریں گے یہاں تک کہ ننانوے فیصد لوگ ہلاک ہو جائیں گے!“ (ان احادیث کو پڑھتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہے کہ قدیم زمانے میں ملکوں اور علاقوں کو دریاؤں یا پہاڑوں یا بڑے شہروں کے نام سے موسوم کرنے کا رواج عام تھا) تو ذرا غور فرمائیں کہ کیا

یہ بات محض ”اتفاقی“ ہے اور عظمتِ حدیث کی دلیل نہیں کہ آج تیل کی دولت کو ”سیال سونا“ قرار دیا جا رہا ہے؟ پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خلیج کی جنگ کا اصل باعث یہی تیل کی دولت ہے؟ مزید برآں کیا یہ امر قابلِ توجہ نہیں ہے کہ عراق کے صدر صدام حسین نے اس جنگ کو ”ام الحارب“ یعنی جنگوں کی ماں یا جنگوں کے سلسلے کا نقطہ آغاز قرار دیا؟ (واضح رہے کہ صدام حسین خواہ اپنی ذاتی حیثیت میں دینی اعتبار سے کتنی ہی ناپسندیدہ شخصیت اور مسلمانوں اور اسلام کے حق میں اسمِ باسُستی یعنی ”صد + دام“ یعنی سوداموں یا جالوں کی حیثیت رکھتا ہو، بہر حال عرب ہونے کے ناتے قرآن سے بھی واقف ہے اور حدیثِ نبویؐ سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ دسمبر ۹۰ء میں میں نے اس کا جو طویل انٹرویو لاس اینجلس میں سی این این پر دیکھا تھا، جو ایک نہایت ماہر و شاطر شخص جان راور نے لیا تھا، اس کے موقع پر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کی پشت پر جو طغریٰ آویزاں تھا وہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۸ کے اس حصے کا تھا: ”بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ“ یعنی ”ہم حق کا کوڑا باطل کے سر پر دے مارتے ہیں، جو اس کے دماغ کا بھر کس نکال دیتا ہے اور اس طرح باطل نیست و نابود ہو جاتا ہے۔“۔ رہی یہ بات کہ نٹائے فیصد کی ہلاکت کی بات صحیح ثابت نہیں ہوئی تو اولاً اس کا بھی امکان ہے کہ وہ الفاظ کسی خاص محاذ سے متعلق ہوں، مثلاً، جیسے کہ سب کو معلوم ہے، کویت سے پسپا ہونے والی عراقی فوج کا جو حشر ہوا، اس پر تو یہ الفاظ پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ اور ثانیاً ابھی عراق کا معاملہ ختم کہاں ہوا ہے؟ ابھی تو صدام حسین امریکہ اور اس کے حواریوں کے حلق میں پھنسی ہوئی ہڈی بنا ہوا ہے کہ نہ اگلی جائے نہ نگلی جائے! (اس لئے کہ اس کے خاتمے کا مطلب اس پورے علاقے کو ایران کے حلقہ اثر میں دے دینا ہو گا) تو کون سے تعجب کی بات ہو گی اگر کسی آئندہ راولڈ میں امریکہ اور اس کے اتحادی دو سال قبل کی وحشیانہ بمباری سے بھی سو گنا زیادہ بیانے پر بمباری کریں اور کسی خاص شہر یا علاقے میں تباہی اسی درجہ کی ہو جائے جس کا نقشہ حدیثِ نبویؐ میں سامنے آتا ہے؟ اس لئے کہ خلیج کی جنگ سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری ہر ممکن کوشش

کریں گے کہ ان کے کسی ایک سپاہی کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے خواہ دشمن کا بچہ بچہ ہلاک ہو جائے۔

اس موقع پر اس امر کا ذکر بھی دلچسپی کا موجب ہو گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری حضرت یوحنا کے مکاشفات میں بھی جو بائبل کے عہد نامہ جدید کی آخری کتاب میں درج ہیں، عراق کی ایسی ہی شدید تباہی کا ذکر بتکرار و اعادہ موجود ہے۔ ان مکاشفات میں عراق کو ”بڑے شہر بابل“ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور سب سے حیران کن امر یہ ہے کہ اس ”شہر“ کے تین ٹکڑے ہو جانے کی نہایت واضح الفاظ میں خبر دی گئی ہے۔ (دیکھئے کتاب ”مکاشفات“ کے باب ۱۶ کی آیات ۱۸-۱۹) اور آج یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے موجود ہے کہ عراق بالفعل تین حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ چنانچہ شمال میں کردستان تقریباً خود مختار ہو چکا ہے اور جنوبی علاقے کو ”نوفلائی زون“ قرار دے کر عملاً عراق کی حکومت کے کنٹرول سے آزاد کر دیا گیا ہے اور صرف بقیہ درمیانی علاقے پر حکومت بغداد کی واقعی عملداری باقی رہ گئی ہے۔

اسی طرح آج سے ساڑھے بارہ سال قبل خود میرے لئے یہ بات ناقابل قیاس تھی کہ دنیا میں پھر کوئی ”صلیبی جنگ“ چھڑ سکتی ہے۔ اور سند کی بنیاد پر حدیث نبویؐ پر اعتماد کے باوجود مغربی دنیا کے عام سیکولر مزاج کے باعث یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جن ”ملاحم“ یعنی جنگوں کی احادیث میں خبر دی گئی ہے ان کا دوسرا دور ”مذہبی“ اساس پر ہو گا۔ لیکن اب یہ حقیقت چشم سر کے سامنے موجود ہے کہ بوسنیا ہرزیگووینا سے ایک ”صلیبی جنگ“ کا بالفعل آغاز ہو چکا ہے۔ یادش بخیر یہ بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بہت عجیب ہے کہ اس کے آغاز میں بھی ایک عظیم الشان سلطنت یعنی سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا اور ایک چھوٹے سے ملک ترکی کے سوا دنیا کے نقشے سے اس کا نام و نشان مٹ گیا، اور اختتام پر بھی ایک عظیم سلطنت یعنی سوویت یونین نیا منسٹیا ہو گئی۔ اسی طرح اس کی پہلی دہائی میں بھی ایک جنگ بلقان ہوئی تھی جو پہلی عالمگیر جنگ کی تمہید بنی تھی اور آخری دہائی میں بھی دوسری جنگ بلقان شروع ہو چکی ہے جو احادیث نبویؐ میں

وارد پیشینگوئی کے مطابق تیسری عالمگیر جنگ کا نقطہ آغاز ثابت ہوگی اور اللہ اعلم!!

اہل مغرب سیاسی نظریے کی حیثیت سے سیکولرزم کے ساتھ اپنی تمام تر وابستگی اور تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے اپنی مبینہ رواداری اور وسیع المشرقی کے باوجود تاحال جذباتی اور نفسیاتی سطح پر جس مذہبی عصیت ہی نہیں تعصب میں مبتلا ہیں اس کا ایک نمایاں مظہر تو یہ ہے کہ ترکی اپنے آپ کو مغربی تہذیب و تمدن میں پوری طرح رنگ دینے اور سیکولرزم کو نہ صرف عملاً اختیار کرنے بلکہ دستور و آئین کی سطح پر اسے مضبوط ترین

تحفظات عطا کرنے اور اس طرح گویا ع ”میرے اسلام کو ایک قصہ ماضی سمجھو“ پر پوری طرح عمل پیرا ہو جانے کے باوجود تاحال یورپ کی ”مس کاسن مارکیٹ“ کو ”عہس“ کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو“ پر آمادہ نہیں کر سکا۔ اور دوسرا اہم مظہر جس کی جانب اکثر مسلمانوں کی توجہ اس بناء پر نہیں ہوئی کہ وہ خود اپنی تاریخ سے بے خبر ہیں یہ ہے کہ سال ۱۹۹۲ء کو پوری مغربی دنیا نے ”اسٹین کاسال“ قراردادے کر جوش و خروش سے منایا۔ چنانچہ پورا ملک دامن کی طرح سجایا گیا اور ورلڈ اوپنک وہاں رکھ کر پوری دنیا کو وہاں آنے کی دعوت دی گئی تاکہ دنیا بھر کے لوگ ان کے جشن مسرت میں شریک اور ان کی مسرت و شادمانی کی شدت کا مشاہدہ کر سکیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ چونکہ ۱۹۹۲ء سقوطِ غرناطہ کاسال تھا، لہذا ۱۹۹۳ء میں سپین سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کو پورے پانچ سو سال مکمل ہو گئے تھے!! اس سے بھی بڑھ کر قابلِ غور بات یہ ہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد عرب اسرائیل مذاکرات کے لئے میڈرڈ کو کیوں منتخب کیا گیا، جہاں اس سے قبل کبھی کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد نہیں ہوئی تھی؟ کیا اس سوال کا کوئی جواب اس کے سوا ممکن ہے کہ عربوں کو اسرائیل کے ساتھ ایک میز پر بیٹھنے کی ”ذلت“ کے ساتھ ساتھ بقول اقبال ”تہذیبِ تجازی کے مزار“ کی زیارت کرانی مقصود تھی؟

اور اس ”مغربی“ پر اضافہ کر لیجئے اس ”کبریٰ“ کا کہ کیونززم کے زوال اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد پوری مغربی دنیا نے ”مسلم نڈامنٹلزم“ کو اپنے لئے خطرہ نمبر ایک قرار دے لیا ہے۔ چنانچہ مغربی آقاؤں کی زیر ہدایت مصر اور الجزائر میں تو احیاء اسلام

کے علمبرداروں پر تعذیب و تشدد کی بھٹی دھک ہی چکی ہے، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی تحقیق و تفتیش اور دارو گیر کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور کوئی عجب نہیں کہ اس پر تو عمل کے طور پر دینی مزاج کے حامل عرب نوجوان، بالخصوص وہ جن کے احیائی جوش اور جذبے کو جہاد افغانستان نے زبردست ہمیز دے دی ہے، مشتعل ہو کر بے قابو ہو جائیں اور کوئی عظیم ہنگامہ برپا ہو جائے جس کی گرما گرمی میں کسی مقام پر وہ واقعہ بھی پیش آجائے جس کا ذکر سنن ابی داؤد کی محولہ بالا روایت میں ہے، یعنی: (جیسائیوں کے ساتھ مل کر ایک مشرک دشمن کے خلاف جنگ اور اس پر فتح حاصل ہونے کے بعد) ”پھر تم واپس آؤ گے اور ایک ٹیلیوں والے نخلستان میں پڑاؤ کرو گے تو نصرانیوں میں سے ایک شخص اٹھ کر صلیب بلند کرے گا اور کہے گا کہ صلیب غالب آگئی۔ اس پر مسلمانوں میں سے ایک شخص غضبناک ہو کر صلیب کو توڑ ڈالے گا۔ اس پر رومی (جیسائی) صلح ختم کر دیں گے اور بڑی جنگ کے لئے جمع ہو جائیں گے“ واضح رہے کہ اس قسم کے واقعات ہا اوقات بارود کو چنگاری دکھانے کے مترادف بن جایا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ نجد کے شمال مشرقی علاقے میں، جو امریکہ کے فوجی اڈے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، کسی بھی وقت رونما ہو سکتا ہے۔

قصہ مختصر، ایک عظیم ”صلیبی جنگ“ کے لئے میدان تیزی کے ساتھ ہموار ہو رہا ہے، جو احادیث نبویہ کے مطابق بہت طویل ہوگی اور جس کے کئی مراحل ہوں گے جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں، البتہ ایک بات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان کے دوران ایک جنگ، جسے ”الملحمة العظمیٰ“ قرار دیا گیا ہے، نہایت عظیم اور حد درجہ خوفناک ہوگی۔ (اس موضوع پر ایک نوجوان محقق قاضی ظفر الحق نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ تحقیق کی ہے۔ چنانچہ ان کا ایک مضمون گذشتہ سال آٹھ اقساط میں ”ندائے خلافت“ میں شائع کیا گیا تھا جو ہنوز نامکمل ہے۔ مکمل ہونے پر اسے ان شاء اللہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔ تاہم اس کا اصل حاصل اور لب لباب یہ ہے کہ ان جنگوں کے دوران شدید جانی و مالی نقصانات کی صورت میں امت مسلمہ کے افضل اور

برتر تھے یعنی مسلمان عرب کو ان کے اس اجتماعی جرم کی بھرپور سزا مل جائے گی جس کا ارتکاب انہوں نے دین حق کے نظام عدل و قسط کو ایک کامل نظام زندگی کی صورت میں قائم نہ کر کے کیا ہے۔ ان جنگوں میں ایک مرحلے پر ”دارالاسلام“ صرف حجاز تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور دشمن مدینہ منورہ کے ”دروازوں“ تک پہنچ جائے گا۔ لیکن پھر رحمت خداوندی جوش میں آئے گی، مسلمان عرب ایک نئی ہیئت اجتماعی تشکیل دیں گے اور ایک نئے قائد و امیر محمد ابن عبداللہ المہدی کے ہاتھ پر ”بیعت“ کر کے جوابی کارروائی کے لئے مستعد ہو جائیں گے۔

اس موقع پر بھی یہ تذکرہ یقیناً دلچسپی کا موجب ہو گا کہ عیسائیوں کی روایات میں بھی اس دنیا کے خاتمے سے قبل ایک عظیم جنگ کا ذکر موجود ہے جو حق اور باطل کے مابین ہوگی۔ چنانچہ حضرت یوحنا کے جن مکاشفات کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے ان ہی میں نہ صرف یہ کہ اس جنگ کا ذکر بھی موجود ہے، بلکہ یہ صراحت بھی ہے کہ اس میں حصہ لینے کے لئے ”مشرق کے بادشاہوں کی فوجیں“ بھی آئیں گی، مکاشفات میں اس جنگ کے دن کو ”خدائے اعظم و قادر کا دن“ کہا گیا ہے اور اس کے محل وقوع کا نام ”آرمیگاڈان“ بتایا گیا ہے۔ (دیکھئے ”مکاشفات“ باب ۱۶ آیات ۱۲ تا ۱۶) گویا حدیث نبویؐ کا ”الملحمة العظمیٰ“ اور بائبل کا ”آرمیگاڈان“ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں!

احادیث نبویہؐ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان جنگوں کے پہلے مرحلوں میں مقابلہ صرف عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین ہو گا اور یہودی اگرچہ پس پردہ تو شریک ہوں گے لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔ چنانچہ خلیج کی جنگ کے دوران اس صورت حال کی بھی ایک ابتدائی جھلک دنیا کے سامنے آچکی ہے کہ امریکہ اور اس کے خوار یوں نے اسرائیل کو جنگ میں شرکت سے روک رکھا۔ اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود پوری کی۔ (چنانچہ اتحادی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل شوارز کراف نے تو بعد میں۔ ”نکل جاتی ہے جس کے منہ سے جی بات مستی میں۔ فقیر مصلحت میں سے وہ رنبدارہ خوار اچھا!“ کے مصداق یہ ”اُن کنی“ بھی کہہ ہی دی کہ ”ہم نے یہ جنگ اسرائیل کے تحفظ ہی کے لئے

لڑی تھی!)۔۔۔۔۔ تاہم جب حضرت مہدی کی قیادت میں اور مشرق سے آنے والی ملک کی مدد سے مسلمانین عرب کامیابیاں حاصل کرنی شروع کریں گے تو یہودی بھی جنگ میں کود پڑیں گے اور یہی مرحلہ ”المسیح الدجال“ کے خروج کا ہوگا۔۔۔۔۔ جس کے ہاتھوں مسلمانوں پر عذاب الہی کے کچھ مزید اور شدید تر کوڑے پڑیں گے۔ تاہم اس کے بعد حضرت مسیحؑ نازل ہوں گے اور ان کے ہاتھوں نہ صرف یہ کہ دجال قتل ہوگا بلکہ پوری قوم بنی اسرائیل پر بھی اللہ کا وہ عذاب استیصال نازل ہو جائے گا جس کے مستحق وہ اب سے دو ہزار برس قبل حضرت مسیحؑ کا انکار کر کے ہو چکے تھے۔ چنانچہ اگرچہ ابتداءً مسیح الدجال کے ہاتھوں ”عظیم تر اسرائیل“ وجود میں آجائے گا، تاہم بالآخر وہی ”عظیم تر اسرائیل“ سابقہ معزول و مغضوب امت مسلمہ کا ”عظیم تر قبرستان“ بن جائے گا۔

جہاں تک دجالی فتنے اور دجال اکبر اور مسیح الدجال کی شخصیت (یا شخصیتوں) کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ ان کا ذکر احادیث نبویہؐ میں جن مختلف پیرایوں میں آیا ہے ان کے بعض پہلو کم از کم راقم الحروف کے علم و فہم کی حد تک تاحال عقدہ لایخل کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کے حل کے لئے کسی عظیم اور محقق محدث ہی کا انتظار کرنا ہوگا۔ البتہ اس مسئلے کے چند پہلو بالکل واضح بھی ہیں۔ بالخصوص ”لامح“ کے سلسلے میں جس مسیح دجال کے خروج کا ذکر آتا ہے اس کا معاملہ اپنی جگہ بھی بالکل واضح ہے، اور دنیا کے موجودہ حالات جو رخ اختیار کر چکے ہیں ان کے پیش نظر تو بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ظہور و خروج کے لئے سٹیج بھی بالکل تیار ہو چکا ہے۔

دجالی فتنے کے بارے میں اب سے کوئی ساٹھ برس قبل سورۃ الکہف کے حوالے سے ایک نہایت مفصل اور عالمانہ تحریر ایک ایسے عالم و فاضل شخص کے قلم سے نکلی تھی جو معقول و منقول، اور شریعت و طریقت چاروں کے جامع بھی تھے اور ان میں سے ہر ایک میں نہایت بلند مقام اور اعلیٰ مرتبے کے حامل بھی۔ یعنی مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ۔ راقم کو ان کے نقطہ نظر سے کمال اتفاق ہے۔ چنانچہ راقم نے بھی ان مباحث کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنے سورۃ الکہف کے دروس میں بیان کیا ہے جو بحمد اللہ آڈیو

کیمش کی صورت میں محفوظ ہیں۔

ان مباحث کا تلباب یہ ہے کہ دجالی فتنے سے مراد عہدِ حاضر کی مادہ پرستانہ تہذیب ہے جس کے پورے تانے بانے اور تمام تر رگ و پے میں یہ نقطہ نظر سرایت کئے ہوئے ہے کہ اصل اہمیت کی حامل اور توجہ و التفات کے قابل یہ کائنات ہے نہ کہ خالق کائنات کی ذات، اور مادہ اور اس کے خصائص و قوانین ہیں نہ کہ روح اور اس کی کیفیات، اور یہ حیاتِ دنیوی اور اس کی فلاح و بہبود ہے نہ کہ حیاتِ اخروی اور اس کی فوز و نجات۔ چنانچہ نقطہ نظر کی اس تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ خالق نے انسان کو علم کے حصول کے جو ذرائع عطا کئے تھے یعنی (۱) حواسِ ظاہری اور ان سے حاصل شدہ معلومات سے استدلال اور استنباط کے لئے عقل کا استعمال، اور (۲) باوق الطبیعی حقائق تک رسائی اور عملی ہدایت کے لئے وحی آسمانی کی پیروی، ان میں سے انسان نے مؤخر الذکر سے بالکل صرف نظر کر لیا ہے اور ساری توجہ کو صرف مقدم الذکر پر مرکوز کر دیا ہے۔ چنانچہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تو بے پناہ ترقی ہوئی لیکن اخلاق اور انسانیت کا دیوالہ نکل گیا۔ اس اعتبار سے اگر تہذیبِ حاضر کو ”ٹیک چشمی“ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی ماویٰ آنکھ تو چوہٹ کھلی ہوئی ہے جبکہ روحانی آنکھ بالکل بند ہو چکی ہے۔ بہر حال، اس دجالی فتنے نے اگرچہ اس وقت پورے کرہ ارضی اور تمام عالمِ انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، لیکن زیادہ افسوس اور ملامت و ماتم کے قابل ہے امتِ مسلمہ اور اس کا بھی افضل اور برتر حصہ یعنی مسلمانین عرب کہ وہ بھی قرآن حکیم ایسی کامل اور محفوظ کتابِ ہدایت کے حامل اور اس پر ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود اس فتنے میں پوری شدت کے ساتھ، بلکہ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہی مبتلا ہیں۔ چنانچہ کتابِ الملاحم کی احادیث میں بھی ایک ایسے فتنے کا ذکر ہے جس سے ”عرب کا کوئی گھر نہیں بچے گا“ اور بظاہر احوال وہ یہی مادہ پرستی اور اس کے لازمی نتیجے یعنی عیاشی و فحاشی کا فتنہ ہے جو ان کے معاشرے میں اس لئے زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے کہ ان کے یہاں سیال سونے کے باعث دولت کی شدید ریل ریل ہو گئی ہے۔

بہر حال، نبی اکرم ﷺ نے جس دجالی فتنے کے اثرات سے اپنے دین و ایمان کو

بچانے کے لئے سورۃ الکہف اور خصوصاً اس کی ابتدائی اور آخری آیات کو اکسیر کی سی تاثیر کی حامل اور تیرہ ہدف قرار دیا ہے وہ یہی مادہ پرستی، دُنا پرستی، زر پرستی اور شہوات پرستی کا فتنہ ہے!

اور اب آئیے دجال یا دجالوں کی جانب، تو ایک بات تو یہ بالکل واضح ہے کہ آنحضور ﷺ نے اپنے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے تمام اشخاص کو ”دجال“ قرار دیا ہے اور ایک حدیث میں ان کی تعداد بھی بیان فرمادی ہے یعنی تیس۔ البتہ یہ فیصلہ کرنا کم از کم راقم کے لئے مشکل ہے کہ آیا وہ ”دجال اکبر“ جس کے فتنے سے آنحضور ﷺ سمیت جملہ انبیاءؑ نے خود بھی اللہ کی پناہ مانگی اور اپنی امتوں کو بھی خبردار کیا، جو خدائی کا دعویٰ کرے گا اور جملہ اہل ایمان کے ایمان کے لئے شدید امتحان بن جائے گا، اور وہ مسیح الدجال جس کا ذکر کتاب الملاحم میں آخری زمانہ کی جنگوں کے سلسلے میں آتا ہے ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں یا یہ دو جدا اشخاص ہوں گے۔ البتہ جہاں تک مؤخر الذکر کا تعلق ہے اس کا معاملہ بالکل واضح اور یقینی سمجھ میں آجانے والا ہے!

در اصل یہود کی روایات اور عمدتاً قدیم میں مذکور انبیاء کرام کی پیشینگوئیوں میں ایک ایسے ”سیحا“ کی خبر تو اتر کے ساتھ وارد ہوئی تھی جو بنی اسرائیل کو ”ذلت“ اور ”مسکنت“ سے نجات دلا کر انہیں ارض مقدس کے علاوہ اس پورے علاقے پر از سر نو غلبہ اور ممکن عطا کر دے گا جہاں تاریخ کے کسی بھی دور میں انہیں حکومت یا بالادستی حاصل رہی ہے۔ چنانچہ مکابلی سلطنت کے زوال کے بعد جب بنی اسرائیل پر پہلے یونانیوں اور پھر رومیوں کی محکومی مسلط ہوئی تو وہ اپنے ”مسیح موعود“ کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ لیکن جب وہ مسیح موعود، عیسیٰ ابن مریمؑ کی صورت میں تشریف لے آئے تو یہود کی انتہائی بد بختی کہ انہوں نے بحیثیت مجموعی ان کا انکار کیا اور انہیں صرف ربوبی نہیں کیا بلکہ کافر اور مرتد ٹھہرا کر واجب القتل قرار دے دیا اور اپنے پس پڑتے تو سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ نے آنجنابؑ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہود کے یہاں ”مسیح“ کی جگہ تاحل خالی ہے اور وہ اپنے مسیحا کا اب بھی انتظار کر

رہے ہیں۔

حضرت مسیحؑ کے رفیع ساوی کے بعد سے اب تک یہودیوں پر جس ذلت و مسکنت اور کثرت و ادبار کے سائے رہے ان کے مختلف ادوار کی تاریخ کسی گذشتہ صحبت میں بیان ہو چکی ہے۔ اس وقت جس حقیقت کی جانب توجہ دلائی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اب سے لگ بھگ ایک سو سال قبل (۱۸۹۷ء میں) بعض نہایت ذہین لیکن عیار اور سازشی مزاج کے یہودیوں نے اپنی عظمت گذشتہ اور سطوت پارینہ کی بازیافت کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا جس پر عمل کے نتیجے میں انہیں پہلی کامیابی ۱۹۱۷ء میں ”اعلان بالفور“ کی صورت میں حاصل ہوئی جس کے ذریعے ارض فلسطین پر ان کا ”حق“ بھی تسلیم کر لیا گیا۔ دوسری اور بڑی کامیابی ۱۹۴۸ء میں حاصل ہوئی جب فلسطین میں ان کی ایک آزاد ریاست قائم ہو گئی اور اسرائیل کا خنجر عالم عرب کے سینے میں پھنسا ہو گیا۔ پھر ایک اور کامیابی ۱۹۶۷ء میں حاصل ہوئی جب پھر روزہ جنگ کے نتیجے میں اسرائیل کی حدود میں وسعت اور رقبے میں اضافے پر مشرود بیت المقدس یعنی یروشلم پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ حال ہی میں ایک اور کامیابی انہیں فتح کی جنگ کے بعد حاصل ہوئی ہے اور وہ یہ کہ فلسطینیوں سمیت تمام عرب ممالک نے اسرائیل کو اس حد تک تو تسلیم کر ہی لیا کہ اس کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اب ظاہر ہے کہ ان کی آخری منزل مقصود صر ”دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا“ کی مصداق کابل بن چکی ہے اور وہ ہے عظیم تر اسرائیل کا قیام اور یکل سلیمانی کی تعمیر نو۔ اس آخری منزل تک پہنچنے کے لئے یہود کا سازشی ذہن ایسی تدابیر اختیار کرے گا کہ ”مسلم نڈا منٹلازم“ کا ہوا دکھا کر مغرب کی عیسائی دنیا کو مسلمانوں خصوصاً عربوں سے لڑوا دے۔ چنانچہ یہی سلسلہ ”ملاحم“ کا اصل پس منظر ہو گا اور اس کے ضمن میں جب اسرائیلی یہودی دیکھیں گے کہ حضرت مہدیؑ کی قیادت میں مسلمانوں کا پلوا بھاری ہونے لگا ہے تو کوئی اسرائیلی لیڈر ”آنا المسیح“ کا نعرو لگا کر میدان میں کود جائے گا چنانچہ یہی ”المسیح الدجال“ ہو گا جس کے ہاتھوں مسلمانوں کو شدید ہزیمت اٹھانی پڑے گی اور ایک بار تو عظیم تر اسرائیل قائم ہو ہی جائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پھر اللہ

تعالیٰ اصل حضرت مسیحؑ کو بھیج کر یہودیوں کا قلع قمع کر دے گا اور وہی عظیم تر اسرائیل ان کا عظیم تر قبرستان بن جائے گا۔ وَمَا ذَلِكُمْ عَلٰی اللّٰهِ بِعَزِيزٍ ۱۱

ان تمام امور میں ظاہر ہے کہ سوائے حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے کوئی ایک بات بھی نہ خلافِ قیاس ہے نہ عام عادی قوانینِ طبعی کے متضاد البتہ عہدِ حاضر کے دجالی فتنے یعنی مادہ پرستانہ نقطہ نظر کے غلبے کے باعث خود مسلمان، بالخصوص ان کے جدید تعلیم یافتہ طبقات اور ان میں سے بھی خاص طور پر وہ جو فتنہ قادریانیت اور فتنہ انکار حدیث سے متاثر ہیں حضرت عیسیٰؑ کے ریفِ سلوی ہی کے قائل نہیں رہے، تو نزول کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ تاہم اس معاملے میں کسی ایسے شخص کو کوئی اشکال لاحق نہیں ہو سکتا جو ایمان رکھتا ہو کہ جملہ قوانینِ طبیعیہ اللہ تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں اور ان کے باعث اس کے ہاتھ بندھ نہیں گئے ہیں بلکہ ”يَذٰهُبُ مَبْنُوۡطَانِ“ کے مصداق وہ جب چاہے ان قوانینِ طبیعیہ کو معطل یا ساقط کر سکتا ہے۔ اسی طرح جملہ اشیاء میں تمام خواص و صفات اور کل تاثیرات اس ہی کی ودیعت کردہ ہیں، وہ جب چاہے انہیں سلب کر سکتا ہے۔ مزید برآں وہ مادی اسباب و وسائل کا محتاج نہیں، بلکہ جملہ مادی اسباب و ذرائع اس کے ”اِزْن“ کے منتظر رہتے ہیں الغرض یہ معاملہ ایک قادرِ مطلق اور ”فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ“ خدا پر ایمان باغیب اور اس کی قدرتِ کلمہ اور حکمت بالغہ پر یقینِ کامل کا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا حصہ وافر عطا فرمائے۔ آمین!

جیسے کہ گذشتہ صحبت میں عرض کیا جا چکا ہے، ان مباحث میں سے اکثر کی اہمیت صرف علمی اعتبار سے ہے۔ چنانچہ ان پر گفتگو ہمیں ختم ہو رہی ہے۔ ہمارے لئے عملی اعتبار سے اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ بحیثیتِ پاکستانی مسلمان ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور ارضِ مشرق کے یکین ہونے کے ناطے ہماری کیا خصوصی ذمہ داریاں ہیں۔ چنانچہ آئندہ اسی مسئلے پر گفتگو ہوگی۔

۲۲ جون ۱۹۹۳ء

ملت اسلامیہ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

باب سیزدہم

اگرچہ بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی کل تعداد پونے دو ارب تک پہنچ چکی ہے، تاہم محتاط اندازوں کے مطابق بھی یہ تعداد سو ارب کے لگ بھگ یعنی ایک سو بیس اور ایک سو تیس کروڑ کے مابین ضرور ہے۔

سورۃ الجمعہ کی دوسری اور تیسری آیات کی رو سے تو یہ امت صرف دو حصوں میں منقسم ہے۔ یعنی ایک ”مُتّی“ عرب جن کو بقیہ تمام مسلمانوں پر مطلق فضیلت اولاً اس بناء پر حاصل تھی کہ خود نبی اکرم ﷺ بھی ان ہی میں سے تھے۔ اور ثانیاً اس بناء پر کہ ان ہی کی جانب آپ کی خصوصی بعثت تھی۔ چنانچہ ان ہی کی زبان میں اللہ کا آخری پیغام اور کامل ہدایت نامہ نازل ہوا اور دوسرے ”آخرین“ یعنی بقیہ تمام نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے مسلمان جو وقتاً فوقتاً امت محمدیہ ﷺ میں شامل ہو کر اس کی عمومی فضیلت میں شریک ہوتے چلے گئے۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ امت تین حصوں میں منقسم قرار دی جاسکتی ہے یعنی:

(۱) مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ان ممالک کے لوگ جن کی مادری زبان عربی بن چکی ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ بیس کروڑ گویا کل امت کا چھٹا حصہ ہیں۔ (۲) سابق بڑے عظیم ہند اور موجودہ بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے وہ مسلمان جن کی مادری زبانیں اور بولیاں تو بے شمار ہیں لیکن سب کی ”لنگوا فرینکا“ کی حیثیت اردو کو حاصل ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ چالیس کروڑ، یعنی کل امت کا تیسرا حصہ ہیں۔ اور (۳) باقی پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمان جن کی مجموعی تعداد ساٹھ کروڑ کے قریب ہے اور اس طرح وہ پوری

امت کی مجموعی تعداد کا نصف ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی کے لگ بھگ تو صرف انڈونیشیا اور ملائیشیا میں آباد ہیں، باقی دو تہائی میں ترکی، ایران اور افغانستان ایسے خالص اور قدیم مسلمان ممالک کے علاوہ مغربی اور وسطی افریقہ کے ممالک اور سابق روسی ترکستان اور چینی ترکستان میں آباد مسلمان شامل ہیں۔

ان ایک ارب کے قریب غیر عرب مسلمانوں میں ایک اضافی درجہ فضیلت گذشتہ چار سو سال سے بر عظیم پاک و ہند میں آباد مسلمانوں کو حاصل رہا ہے جس کی بناء پر صر "جن کے رتبے ہیں سوا" ان کی سوا مشکل ہے! کے مصداق اللہ کے دین اور محمد ﷺ کی رسالت کے ضمن میں ایک خصوصی ذمہ داری کا بھاری بوجھ ان کے کندھوں پر تھا جسے تاریخ کی ایک کروٹ نے پورے کاپورا مسلمانان پاکستان کے کندھوں پر ڈال دیا ہے جس کا صحیح فہم و شعور صر "اپنی خودی پہچان" او غافل افغان! کے مصداق ملت اسلامیہ پاکستان کے لئے نہایت ضروری ہے۔

سب جانتے ہیں کہ فضل یا فضیلت خالص وہی شے ہے اور عالم انسانی میں فضیلت کی اصل اساس نبوت رہی ہے۔ چنانچہ سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی اس عظیم فضیلت کی بنیاد جس کا ذکر سورۃ البقرہ کی دو آیات (۱۲۷ اور ۱۲۸) میں ان الفاظ میں وارد ہوا کہ: "وَاَنْزَلْنٰی فِصْلَتَکُمْ عَلٰی الْعَالَمِیْنَ" یعنی "میں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمادی تھی!" یہی تھی کہ ان میں حضرت موسیٰ سے حضرت عیسیٰ تک پورے چودہ سو برس نبوت کا سلسلہ اس طور سے جاری رہا کہ کبھی یہ تار ٹوٹا ہی نہیں! حضرت عیسیٰ کے بعد مسلسل چھ سو سال "فترتِ اولیٰ" کا زمانہ ہے جس کے دور ان نبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور اس کے بعد نبوت و رسالت کا مادہ کامل یا خورشید جہاں تاب محمد ﷺ کی صورت میں طلوع ہوا جن کے سر مبارک پر ختم نبوت اور تکمیل رسالت کا تاج رکھا گیا۔ چنانچہ ایک جانب آپ خود "اِنْ فَضَّلْتُکُمْ کَانَ عَلَیْکُمْ کِبَیْرًا" یعنی "یقیناً اللہ کا فضل آپ پر تو نہایت ہی عظیم و کبیر ہے!" کے مصداق کامل قرار پائے تو دوسری

جانب آپ کی امت میں شامل ہونے والے بھی، خواہ وہ ”مئی“ عربوں میں سے تھے، خواہ ”آخرین“ میں سے، آپ کے اس فضل عظیم کے وارث قرار پائے، ”فجاءک“ ”فَضَّلَ اللّٰهُ یَوْمَئِذٍ مِنْ نِّسَاءِ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ“ یعنی ”یہ اللہ کا فضل ہے“ وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ آپ پر نبوت کا سلسلہ ختم اور منقطع ہو گیا، تاہم حسب ذیل آیات کی رو سے آپ کی رسالت کے فرائض کی عالمی سطح پر اور ناقیام قیامت اور ایگی مجموعی طور پر آپ کی امت ہی کے حوالے کی گئی:

(۱) کُنْتُمْ خَیْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰)

”تم بہترین امت ہو جسے جملہ انسانوں کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ تمہارا کام ہی یہ ہے کہ نیکی کا حکم دو، برائیوں سے روکو اور خود اللہ پر پختہ ایمان رکھو۔“

(۲) وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (الحج: ۸۷)

”اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جتنا اور جیسا کہ اس کے لئے جملہ کا حق ہے۔ اللہ نے تمہیں منتخب فرمایا ہے۔ تاکہ رسول (ﷺ) تم پر حجت قائم کریں اور تم پوری نوع انسانی پر حجت قائم کرو۔“

(۳) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ: ۱۴۳)

”اور اس نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہی اس لئے ہے کہ تم تمام لوگوں پر حجت قائم کرو اور تمہارے رسول (ﷺ) تم پر حجت قائم کریں۔“

اس فریضہ رسالت محمدی کی اور ایگی اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری اگرچہ امت محمدیہ (ﷺ) پر بحیثیت مجموعی ڈالی گئی ہے تاہم ”جن کے رُتبے ہیں سوا“ ان کی سوا مشکل ہے! اور۔

”نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد“

خدا بیچ انگشت یکساں نہ کروا“

کے مصداق، اور اللہ تعالیٰ کے اس ابدی قانون کے مطابق کہ ”اللہ ہر ایک پر ذمہ داری کا بوجھ اس کی وسعت کے مطابق ہی ڈالتا ہے“ جو قرآن حکیم میں متعدد بار بیان ہوا ہے، اس عظیم ذمہ داری کا سب سے زیادہ بوجھ ان لوگوں پر ہے جن کی مادری زبان عربی ہے، لہذا انہیں قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے کسی اضافی محنت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن حکیم ہی نبوت کے اس سلسلے کا اصل قائم مقام ہے جو نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارک پر ختم اور منقطع ہو چکا ہے۔

تاہم ختم نبوت سے جو خلا پیدا ہوا اس کو پُر کرنے کی ایک اضافی تدبیر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے تحت یہ اختیار فرمائی کہ ایک جانب مجددین کا سلسلہ جاری فرمایا جو وقتاً فوقتاً دین کی اصل تعلیمات اور اللہ کی اصل ہدایت کو از سر نو نکھار کر پیش کرتے رہے۔ اور دوسری جانب یہ ضمانت دے دی کہ ”اس امت میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ یا جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی“ (بخاری و مسلم عن معاویہ) اور یہ دونوں امر اس اعتبار سے باہم لازم و ملزوم ہیں کہ بالکل فطری اور منطقی طور پر ہر مجدد کی تعلیمات اور مساعی کے نتیجے میں لامحالہ ایک حلقہ یا گروہ ایسا وجود میں آتا رہا جو دین حق کی اصل تعلیمات کا علمبردار اور اپنے وجود کے اعتبار سے کم از کم ذاتی زندگی اور انفرادی سیرت و کردار کی حد تک اسلام کی حقیقی تعلیمات کا نمونہ اور آئینہ دامن بن گیا۔ اگرچہ دنیا کے اس طبعی قانون کے مطابق کہ ہر جوانی پر لازماً بڑھاپا بھی آکر رہتا ہے اور ہر کمال کو بالآخر زوال سے دو چار ہونا ہی پڑتا ہے یہ حلقہ یا گروہ یا جماعت دوسری یا تیسری یا زیادہ سے زیادہ چوتھی نسل تک پہنچ کر لازماً ایک تقلیدی اور موروثی ”فرقہ“ بن جاتا رہا۔ اور اس طرح ایک نئے مجدد کی ضرورت پیش آتی رہی جس کے زیر اثر ایک نئی جمعیت یا جماعت وجود میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ

حدیث نبویؐ میں مجددین کے ضمن میں سو سو سال کے وقفے کا ذکر ہے، یعنی: ”اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر سو سال کے سرے پر ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو دین کی تجدید کرتے رہیں گے یعنی اسے تازہ کرتے رہیں گے۔“ (ابوداؤد عن ابی ہریرہؓ)

بہر حال ان مجددین امت اور ان کے علائقہ اور متبعین کی مساعی کے نتیجے میں دین حق کی تعلیمات گزشتہ چودہ سو سال کے دوران اسی طرح منتقل ہوتی چلی آئیں جس طرح اولپک نارچ (مشعل) ایک کھلاڑی سے دوسرے کھلاڑی کو منتقل ہوتی رہتی ہے یا شیر شاہ سوری کے زمانے میں ڈھاکہ سے پشاور تک ڈاک کے تھیلے ہر تیس میل کے بعد ایک گھڑ سوار سے دوسرے کو منتقل ہوتے رہتے تھے!

اور اب اس پس منظر میں مشاہدہ فرمائیے اس عظیم حقیقت کا کہ پورے ایک ہزار برس تک مجددین کا یہ سلسلہ عالم عرب ہی میں جاری رہا۔ چنانچہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ اور حضرت حسن بصریؒ سے امام غزالیؒ اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ تک پورے سات سو برس کے عرصے میں تمام مشاہیر علماء ائمہ ہدایت اور مجددین امت عالم عرب ہی میں پیدا ہوتے رہے۔ لیکن فتنہ تاتار کے دوران جبکہ وسطی اور مغربی ایشیا شورش و ہلاکت اور تباہی و بربادی کا شکار ہوئے اسلام کی علمی اور روحانی وراثت تدریجاً سرزمین ہند کو منتقل ہوتی چلی گئی تاکہ جیسے ہی امت کی تاریخ کے ”الف ثانی“ یعنی دوسرے ہزار سالہ دور کا آغاز ہوا تجدید دین کا اصل مرکز ہندوستان بن گیا۔ چنانچہ گیارہویں صدی ہجری کے عظیم ترین مجدد شیخ احمد سرہندیؒ بھی یہیں پیدا ہوئے جن کے مرقد کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ”وہ خاک کہ ہے زیرِ قلم مطلع انوار“ اور جن کی ذات کے بارے میں فرمایا ہے کہ ”جن کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار!“ پھر بارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی یہیں پیدا ہوئے جو تنہا اپنی ذات میں جملہ علوم اسلامی ہی کے مجدد نہیں فکرِ اسلامی اور حکمتِ دینی کے بھی مجدد اعظم تھے۔ پھر تیرہویں صدی ہجری میں سید احمد بریلویؒ بھی یہیں پیدا ہوئے جو بلاشبہ سلوکِ محمدی ﷺ اور جہادِ اسلامی کے مجدد اعظم تھے اور ان کا اور ان کے ساتھی شہداء کا خون سرزمینِ ہلا کوٹ

میں جذب ہوا۔

بنا کردند خوش رستم بہ خاک و خون غلطیدند

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را!

اسی طرح چودھویں صدی ہجری (جسے ختم ہوئے ابھی صرف تیرہ برس ہوئے ہیں!) میں بھی جو اعظم رجال سرزمین ہند میں پیدا ہوئے ان کی نظیر پورا عالم اسلام پیش کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ طبقہ علماء میں سے اسیرالشاہ شیخ السند مولانا محمود حسنؒ ایسی عظیم شخصیت اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے علامہ اقبال ایسا مفکر ملت اور حکیم امتؒ پھر مولانا محمد الیاس ایسا عظیم مبلغ اور مولانا مودودی ایسا عظیم مصنف پورے عالم اسلام میں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا! (ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَّشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ)

الغرض گزشتہ پوری چار صدیوں کے دوران اگر دین کے علم و فکر ہی نہیں دعوت و جہاد کی تجدید کا مرکز بھی ہندوستان بنا رہا تو ظاہر ہے کہ یہ مشیتِ ایزدی کے تحت ہی ہوا اور جس طرح علامہ اقبال نے کوہِ ہمالیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ ”برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سرا“ اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ ”الفِ ثانی“ کی ان تجدیدی مساعی نے ملتِ اسلامیہ ہند کے سر پر ایک عظیم دستارِ فضیلت باندھ دی ہے جس کی بناء پر اس کی ذمہ داری بھی بقیہ پوری امتِ مسلمہ کے مقابلے میں نہایت عظیم اور گراں اور وہ چند ہی نہیں سونگناں لگی ہے!

اور اب توجہ فرمائیے تاریخ کی اس ”کروٹ“ کی جانب جس کے نتیجے میں اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر آگیا ہے۔ یہ کروٹ تحریکِ پاکستان اور اس کے نتیجے میں قیامِ پاکستان سے عبارت ہے جس کا اعلامیہ مقصد اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام اور پورے عالمِ انسانیت کے سامنے اسلام کے ”اصولِ حریت و

لے ترجمہ: ”یہ اللہ کا فضل ہے“ وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

(سورۃ الحجہ، آیت ۴)

اخوت و مساوات کا ایک نمونہ“ پیش کرنا تھا۔ چنانچہ مفکر و مصوّر پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اپنے خطبہ اللہ آباد (۱۹۳۰ء) میں فرمایا تھا کہ: ”مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیر مبرم ہے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو پردے عرب ملوکیت (امپیریلزم) کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر دوبارہ اصل اسلام کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں“ اور بانی و معمار پاکستان محمد علی جناح نے بھی بارہا ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ اور قیام پاکستان کی صورت میں غالب اور جارج ہندو اکثریت کے ملک بھارت میں شامل رہ جانے والے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی۔

”جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجر اں

ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!“

کے مصداق اس سے بالکل بے پروا ہو کر کہ تقسیم ہند کے بعد ان پر کیا بیتے گی، تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ ہی نہیں اصل فیصلہ کن کردار ادا کر کے گویا مذکورہ بالا چار صد سالہ تجدیدی مساعی کی وراثت کے ناطے جو عظیم ذمہ داری جملہ مسلمانین ہند پر عائد ہوتی تھی اس میں سے اپنے حصے کا ”فرض کفایہ“ ادا کر دیا جس کی قیمت وہ تاحل مسلسل اپنے جانی ضیاع اور مالی نقصان کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ بنا بریں اب اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر ہے۔ اور اس کی قسمت یا بد قسمتی بالکلہی اسی کے ساتھ وابستہ ہے!

اور یہ بلاشبہ ہر باشعور پاکستانی مسلمان کے لئے اہم ”لحدّ فکریہ“ ہے کہ (۱) اگر وہی بنی اسرائیل جو ”ہم نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا کر دی تھی!“ کے مصداقِ کامل تھے، اللہ کے ساتھ کئے جانے والے قول و قرار اور عہد و میثاق سے انحراف اور اللہ کے دین اور شریعت کی غلط نمائندگی کے باعث ”ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!“ کی تصویر بن گئے، اور (۲) مسلمانین عرب بھی اپنی تمام تر فضیلتوں کے باوجود ان ہی جرائم کی پاداش میں اللہ کے بے لاگ عدل کے باعث معزول

تھا۔ چنانچہ میں نے قوم یونسؑ کی مثال اسی خیال سے دی ہے کہ شاید اللہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کو بھی اس ہی کے مانند اجتماعی توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین، یا رب العالمین! اور میری تشویش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلے عذاب سے قبل بھی پچیس برس کی مہلت دی تھی (سقوطِ ڈھاکہ کے وقت قیامِ پاکستان پر قمری حساب سے پچیس برس بیت چکے تھے!) اور اب پھر قمری حساب سے دوسرے پچیس برس کی مہلت کے ختم ہونے میں کل پونے تین سال باقی رہ گئے ہیں! الغرض، معاملہ وہی ہے کہ عذرِ حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اور

فطرتِ افراہ سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

اور

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو، زمانہ چالِ قیامت کی چل گیا!

پاکستان کا مستقبل

اگرچہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان مبارک تو یہ ہے کہ ”موت کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا کرو، جو تمام لذتوں کا خاتمہ کر دینے والی ہے“ (ترمذی) ”نسائی“ اور ابن ماجہ“، عن ابی ہریرہؓ) اسی طرح آپ کا فرمان مبارک یہ بھی ہے کہ موت کا تذکرہ اور قرآن کی تلاوت کثرت کے ساتھ کیا کرو، چنانچہ ایک بار آپ نے فرمایا کہ ”انسانوں کے دلوں پر بھی زنگ لگ جلیا کرتا ہے جیسے کہ لوہے پر زنگ لگ جاتا ہے اگر اس پر پانی پڑتا رہے“ اس پر جب آپ سے سوال کیا گیا کہ: ”حضورؐ یہ فرمائیے کہ پھر ان کو از سر نو جلا کیسے دی جائے؟“ تو آپ نے ارشاد فرمایا: ”دو کام کثرت کے ساتھ کیا کرو۔ ایک موت کا ذکر اور دوسرے تلاوت قرآن“ (سنن بیہقی) لیکن آج کل کے ”مترفین“ یعنی مرتبہ الحلال لوگ اور اصحاب دولت و ثروت موت کے ذکر کو ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا ایک دوست نے، جو پی آئی اے میں کام کرتے ہیں، یہ بتایا تھا کہ جب سعودی امیر لائنز کے دیکھا دیکھی پی آئی اے کی پروازوں کے آغاز میں بھی سفر کی اس دعا کا اہتمام کیا جانے لگا جو قرآن حکیم میں وارد ہوئی ہے تو بہت سے لوگوں نے باضابطہ احتجاج کیا اور زور دیا کہ اس دعا کا صرف پہلا حصہ پڑھا جائے یعنی: ”سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقَرَّبِينَ“ لیکن دوسرا حصہ نہ پڑھا جائے جس میں موت کا تذکرہ ہے یعنی: ”وَإِنَّا إِلَىٰ

۱۔ سورۃ الزخرف، آیت ۱۳-۱۲

۲۔ ترجمہ: ”پاک ہے وہ ہستی جس نے ہمارے لئے اس (سوار) کو مسخر فرمادیا، ورنہ ہم تو ہرگز اس لائق نہ تھے کہ اس پر قابو پائے“

رَبَّنَا لَمُتَّقِلُونَ“ اس لئے کہ، بقول ان کے، اس طرح تو پی آئی اے گویا پرواز کے آغاز ہی میں تمام مسافروں کو موت کی جھلک دکھا دیتی ہے، جس سے قلوب اور اعصاب پر ”منفی“ اثر پڑتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَيْہِ رَاجِعُونَ!

میں نے ابھی تک تو اس روایت کو بس ایک لطیفہ ہی کے درجہ میں سمجھا تھا، لیکن حال ہی میں جب ایک اچھے بھلے معروف دانشور کی یہ بات سامنے آئی کہ قیامت کا ذکر منفی سوچ کا مظہر ہے تو ”ہمیں یقین ہوا“ ہم کو اعتبار آیا!“ کے مصداق پہلی بات کا بھی ”حق الیقین“ حاصل ہو گیا۔ اگرچہ یہ کتنا مشکل ہے کہ اس پر صدمہ کی کیفیت زیادہ ہوئی یا حیرت اور تعجب کی، کہ ایک مسلمان یہ بات کیسے کہہ سکتا ہے جبکہ قرآن مجید کا تو شاید کوئی ایک صفحہ بھی ایسا نہ ہو جس میں قیامت کا ذکر پورے شد و مد کے ساتھ نہ آیا ہو۔ بالآخر دل کو تسلی دی تو اس خیال کے ذریعے کہ شاید موصوف کی کسی لمبی تحریر کی تلخیص کسی صاحب نے کی ہو اور اس کی بنا پر یہ مغالطہ پیدا ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم!

بہر حال، راقم الحروف اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے اس امر کا تو یقین کمال حاصل ہے ہی کہ قیامت آکر رہے گی، جس کے نتیجے میں موجودہ عالم دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، بلکہ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ اس کا بھی ”حق الیقین“ حاصل ہے کہ اس کے کچھ عرصے کے بعد (جس کی مدت کا علم صرف اللہ کو ہے!) ایک نئے عالم یعنی عالم آخرت کی بساط بچھائی جائے گی، چنانچہ تمام انسانوں کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور پھر حشر و نشر اور حساب کتاب کا معاملہ ہو گا، اور بلا آخر جزا و سزا یعنی جنت یا دوزخ کے فیصلے صادر ہوں گے! جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اس نہایت ابتدائی دور کے خطبے میں وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا، جو آپ نے اپنے پورے خاندان یعنی بنو ہاشم کے مجمعے میں دعوت طعام کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے دیا تھا کہ: ”وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ“ چنانچہ آپ کے الفاظ مبارک یہ تھے:

۱۔ ترجمہ: ”اور ہم سب بالآخر اپنے رب ہی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں!“

۲۔ ترجمہ: ”اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کرو!“ (سورۃ الشعراء، آیت ۲۰۴)

(ترجمہ) ”خدا کی قسم تم سب پر موت وارد ہو کر رہے گی جیسے کہ تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو، پھر تم سب کو لازماً دوبارہ اٹھالیا جائے گا جیسے کہ تم روزانہ صبح کو بیدار ہو جاتے ہو، پھر یقیناً تم سب سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو، اور پھر تمہیں لازماً بدلہ مل کر رہے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا، اور وہ یا تو جنت ہوگی ہمیشہ کے لئے، یا پھر دوزخ کی آگ ہوگی ہمیشہ کے لئے!“ (ماخوذ از ”منہج البلاغہ“)

البتہ اس قیام قیامت اور بعثت بعد الموت کے ساتھ ساتھ مجھے اس کا بھی یقین حاصل ہے کہ قیامت سے قبل پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین حق کا غلبہ اور خلافت علی منہاج النبوت کے نظام کا قیام لازماً واقع ہو کر رہے گا۔ چنانچہ اس کے مفصل دلائل بھی قرآن حکیم کی آیات سے ”ولالت“ کی بنیاد پر، اور احادیث نبویہ سے ”صراحت“ کی اساس پر دے چکا ہوں۔ اور ”سرمہ“ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف! کے مصداق قرآن و حدیث ہی مدینہ مومن کی دو آنکھیں ہیں!

مذکورہ بالا دو امور کے بارے میں تو بجز اللہ مجھے ”حق یقین“ کی کیفیت حاصل ہے، البتہ اپنی ایک تیسری رائے کے ضمن میں میں صرف گمان غالب اور امید واثق کے الفاظ استعمال کر سکتا ہوں۔ (اگرچہ اس کی سرحدیں بھی ”یقین“ کے بالکل ساتھ جاملتی ہیں!) اور وہ یہ کہ غلبہ دین حق اور قیام نظام خلافت کا نقطہ آغاز بننے کی سعادت، ان شاء اللہ العزیز، اسی ارض پاکستان اور اس سے ملحق سرزمین افغانستان کو حاصل ہوگی، جسے ماضی میں ”خراسان“ کہا جاتا تھا! میرے ”اس یقین کی حد کو پہنچنے والے گمان“ کی بنیاد جہاں بعض احادیث نبویہ بھی ہیں، جن کی بنا پر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

”میر عرب کو آئی، لٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے!“

(مثلاً سنن ابن ماجہ کی حضرت عبداللہ ابن حارثؓ سے روایت ہے جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مشرق کی جانب سے ایسے لوگ برآمد ہوں گے جو علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے مہدی کی مدد یعنی ان کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے پہنچیں

گے" اور جامع ترمذی کی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے جس کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا: "خراسان کے علاقے سے سیاہ جھنڈے برآمد ہوں گے اور انہیں کوئی طاقت واپس نہیں پھیر سکے گی یہاں تک کہ وہ ایلیا یعنی بیت المقدس میں نصب کر دیئے جائیں گے" (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں اس کی اصل اور محکم اساس گزشتہ چار سو سال کی تاریخ پر قائم ہے جو گواہی دیتی ہے کہ پچھلی چار صدیوں کے دوران میں تجدیدی دین کا سارا کام بر عظیم پاک و ہند میں ہوا اور اس عرصے میں تمام مجددین اعظم اسی خطے میں پیدا ہوئے۔۔۔۔۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی اور حکمت خداوندی میں کوئی طویل المعیار منصوبہ اس خطہ ارضی کے ساتھ وابستہ ہے۔

پھر سب جانتے ہیں کہ سرزمین افغانستان کا ہمیشہ سے بر عظیم پاک و ہند کے ساتھ یہ "دو طرفہ تعلق" قائم رہا ہے کہ تمام فاتحین تو افغانستان سے ہندوستان کی جانب آتے رہے لیکن صرف ایک استثناء یعنی اسلام کی اولین آمد کے علاوہ تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کا سفر ہمیشہ ہندوستان سے افغانستان کی جانب رہا۔ چنانچہ ماضی میں بدھ مت بھی ہندوستان سے افغانستان گیا تھا اور گزشتہ چار صدیوں کے دوران میں اسلام کی جملہ تجدیدی مساعی کے اثرات کے اعتبار سے بھی افغانستان بر عظیم پاک و ہند کے "تابع" رہا۔ جس کی نہایت نمایاں مثال یہ ہے کہ اگرچہ مسلم فاتحین کے ساتھ تو سلسلہ چشتیہ افغانستان سے ہندوستان آیا تھا لیکن پھر الف خانی کے تجدیدی کارنامے کے اثرات کی صورت میں اولاً سلسلہ مجددیہ پہلے افغانستان اور پھر پورے ترکستان تک پہنچا اور پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے مدرسہ فکر کا اثر و نفوذ بھی وسعت اور سرعت کے ساتھ ارض خراسان تک ممتد ہو گیا۔ اور اس وقت ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے (بشرطیکہ اس میں قرآن اور حدیث کا "سرمد" لگا ہوا ہوا) کہ "وقت کے بچتے دریا" نے ایک جانب بر عظیم ہندوپاک کی پوری چار صدیوں کی تجدیدی مساعی کی وراثت ارض پاکستان میں جمع کر دی ہے اور دوسری جانب ارض خراسان میں اللہ تعالیٰ نے سپر پاور کی باہمی کشاکش کے ذریعے نہ صرف یہ کہ سوئی ہوئی مارشل اسپرٹ کو بیدار کر دیا ہے اور قدیم جذبہ حریت کو مزید متمیز

دید ہے، بلکہ جذبہ جہاد فی سبیل اللہ کو بھی قابلِ لحاظ حد تک قوی بنا دیا ہے۔ تو پھر کون سے تعجب کی بات ہوگی اگر تاریخ کی کوئی کرٹ۔

”عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے

شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی!“

کے مصداق ایک جانب سے مجددینِ ہند کا علم و حکمت اور فکر و فہم اور دوسری جانب سے مسلمانانِ افغانستان کا جذبہ عمل اور جوشِ جہاد دریائے سندھ اور دریائے کلل کے مانند باہم مل کر احیاءِ اسلام، غلبہٴ دین، اور عالمی نظامِ خلافت کے قیام کا نقطہٴ آغاز بن جائیں۔
وَمَا ذَلِك عَلَى اللَّهِ بَعِزًا

میری ان باتوں پر بھی کوئی ”ڈانٹور“ اگر چاہے تو بڑی آسانی کے ساتھ کسی ایسی کی خواب یا مجذوب کی بڑی پھٹی چست کر سکتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی خود میں بھی اس کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہوں کہ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

..... تاہم مجھے یہ اطمینان ہے کہ میری ان باتوں کو کم از کم ”منفی سوچ“ کی مظہر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

البتہ اس تیسری بات کے سلسلے میں دو سوالات کے جواب کے بارے میں میں نہایت متروک بھی ہوں اور ان میں سے ایک کے بارے میں میرا ایک اندیشہ بھی قوی سے قوی تر ہوتا چلا جا رہا ہے جسے قنوطیت اور یاس پسندی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے اور منفی سوچ کا مظہر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ”مَا أَرْيَكُمْ إِلَّا مَا أَرَى“ کے مصداق میں اپنے حقیقی احساسات بیان کرنے پر مجبور ہوں۔

ان دو سوالوں میں سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ ”مَتَىٰ هُوَ؟“ کے مصداق غلبہٴ اسلام کا

۱۔ ترجمہ: ”میں تمہیں وہی کچھ دکھا رہا ہوں جو خود دیکھ رہا ہوں!“ (سورۃ المؤمن، آیت ۲۹)

۲۔ سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۵۱

یہ مرحلہ کب شروع ہوگا؟ اور دوسرا یہ کہ اگر اس کا آغاز پاکستان ہی سے ہونا ہے تو جرح ”کب کھلا تجھ پر یہ راز“ انکار سے پہلے کہ بعد؟“ کے مصداق آیا پاکستان میں دین حق کا غلبہ اور نظام خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام کسی سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے، یا اس سے بھی عظیم تر سانحے اور حادثے کے بعد ہوگا؟ یا اس سے قبل کسی خارجی افتاد کے بغیر ہی ”رضا کارانہ توبہ“ کے ذریعے ہو جائے گا۔

جہاں تک ”مَتٰی هُوَ“ یعنی ”یہ کب ہوگا؟“ کا تعلق ہے، ہمیں قرآن حکیم سے بھی اس سوال کے دو جواب ملتے ہیں، چنانچہ پہلا جواب تو وہی ہے جو سورہ بنی اسرائیل کی اسی آیت (۵۱) میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے: ”قُلْ عَسٰی اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْنًا“ یعنی ”(اے نبی ﷺ) کہہ دیجئے کہ عین ممکن ہے کہ وہ بالکل ہی قریب آگیا ہو!“ بالکل اسی طرح کی ایک بات سورہ المعارج میں بھی وارد ہوئی ہے: ”اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيْدًا وَّاَنَّا نَرَاهُ قَرِيْنًا“ یعنی ”یہ لوگ اسے دور سمجھ رہے ہیں، جبکہ ہم اسے بالکل قریب دیکھ رہے ہیں!“ (آیات ۶-۷) اور دوسرا وہ عمومی جواب ہے جو قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے یعنی یہ کہ: ”قُلْ اِنْ اَدْرٰى اَقْرَبُ اَمْ بَعِيْدًا مَّا تَوْعَدُوْنَ“ یعنی ”(اے نبی ﷺ) کہہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آچکی ہے یا ابھی دور ہے!“ (سورہ الانبیاء: ۱۰۹) اور ”قُلْ اِنْ اَدْرٰى اَقْرَبُ اَمْ بَعِيْدًا مَّا تَوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَّكَ رَبِّيْ اَمَدًا“ یعنی اور ”(اے نبی ﷺ) کہہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ عنقریب پیش آنے والی ہے یا ابھی میرا رب اس کے ضمن میں کچھ تاخیر فرمائے گا!“ (سورہ الجن: ۲۵)

بہر حال سورہ بنی اسرائیل کی محولہ بالا آیت کے مطابق میری رائے بھی یہی ہے کہ پہلے پاکستان اور افغانستان، اور پھر کل روئے ارضی پر دین محمد ﷺ کا غلبہ اب زیادہ دور کی بات نہیں ہے۔ (اگرچہ دونوں مؤثر الذکر آیات کے مطابق اس کا حتمی علم صرف اللہ کو ہے) تاہم میرے تردد کی بنیاد یہ ہے کہ تاحال اس کے آثار کہیں دور دور تک بھی نظر نہیں آ رہے۔ بلکہ ہم بحیثیت قوم و ملت روز بروز سورہ آل عمران کی آیت ۱۷ میں وارد

آغاز ہو گا جس کے نتیجے میں عالمی سطح پر ”شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورد شد سے“ اور ”یہ جن معمور ہو گا نغمہ توحید سے!“ کی کیفیت پیدا ہو کر رہے گی! (واضح رہے کہ مطعم بن عدی حالت کفری میں فوت ہو گیا تھا لیکن آنحضور ﷺ کو اس کے احسان کا اس درجہ پاس تھا کہ آپ نے غزوہ بدر کے بعد قریش کے ستر قیدیوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ”اگر آج مطعم زندہ ہو تا اور وہ ان کی سفارش کرتا تو میں ان سب کو بغیر کسی فدیے اور تالان کے رہا کر دیتا“)

اس ”گمان غالب“ یا امید واثق (جس کی سرحدیں ”یقین“ سے جاملتی ہیں) کے اظہار کے بعد کہ ”ان شاء اللہ العزیز“ اسلام کے عالمی غلبے اور کل روئے ارضی پر نظام خلافت علیٰ منہاج النبوت کے قیام کا نقطہ آغاز ارض پاکستان اور اس سے ملحق افغانستان کا وہ علاقہ بنے گا جو ماضی میں خراسان کہلاتا تھا“ اب آئیے اس دوسرے سوال کی جانب جس کے جواب کے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میں بہت متردد ہوں، یعنی یہ کہ آیا پاکستان میں یہ عظیم انقلاب ”کسی سقوط مشرقی پاکستان جیسے“ یا اس سے عظیم تر سانحے یا حادثے کے بعد ہو گا؟ یا اس سے قبل کسی خارجی افلاک کے بغیر ہی رضا کارانہ توبہ کے ذریعے ہو جائے گا؟“ تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں اپنے حقیقی احساسات اور غدشات کے اظہار، اور انہیں نوک زبان یا نوک قلم پر لانے سے شدید خوف محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ تلخ حقائق کو تو تسلیم کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے، کجا ان کا مواجمہ کرنا (یعنی انہیں Face کرنا) کہ وہ تو بہت ہی دل گردے کا کام ہے۔ جبکہ عام طور پر لوگوں کا طرز عمل اس روایتی کیو تری کا ہوتا ہے جو بلی کو سامنے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ (حالات کا ظاہر ہے کہ اس سے خطرہ تو نہیں ٹل جاتا اور حقیقت تو نہیں بدل جاتی!) لہذا شدید اندیشہ ہے کہ میرے خیالات کو قنوطیت اور یاس پسندی سے تعبیر کیا جائے گا اور بہت سے دانشور انہیں ”منفی سوچ“ کا مظہر قرار دیں گے۔ تاہم ”مجھے ہے حکم اذان“ لا الہ الا اللہ کے مصداق میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ ہم بحیثیت ملک و قوم عذاب الہی کے دوسرے اور شدید تر کوڑے کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ اور۔۔۔

”ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا!“

کے مصداق ہم اپنے اعمال کے اعتبار سے تو ”عذاب اکبر“ کے قطعی مستحق ہو چکے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ اللہ اپنے خصوصی فضل و کرم کے طفیل ہمیں قوم یونسؑ کی سی توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔ (اللہ سے دعا ہے کہ ایسا ہی ہو!)

کچھ عرصہ قبل انہی کالموں میں ”قرآن کا قانونِ عذاب“ کے موضوع پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے جس کے سلسلے میں سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ کا حوالہ بھی آیا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ مستقل ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ وہ کسی قوم پر آخری ”عذاب استیصال“ سے قبل، یعنی اس عذاب سے پہلے جس کے ذریعے اس کا نام و نشان مٹا دیا جائے، چھوٹے عذاب نازل فرماتا ہے تاکہ اگر وہ ہوش میں آسکتی ہو تو آجائے اور توبہ و انابت کی روش اختیار کر کے ”عذاب اکبر“ سے بچ جائے۔ مزید برآں اس عذاب استیصال کے بارے میں یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ چونکہ یہ صرف ان قوموں پر نازل کیا جاتا رہا ہے جن کی جانب اللہ کے رسول مبعوث ہو کر اتمامِ حجت کا حق ادا کر چکے ہوں لہذا نبی اکرم ﷺ پر نبوت اور رسالت کے سلسلے کے ختم ہو جانے کے بعد اس نوع کا عذاب کسی ”نئی“ قوم پر نہیں آئے گا۔ بلکہ یہ حتمی اور کُلّی طور پر صرف سابقہ امت مسلمہ یعنی یہود پر آئے گا جو اولاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو ان کی جانب مبعوث کئے گئے تھے رد کرنے کے باعث اس کے مستحق ہو گئے تھے، اور ثانیاً جب نبی اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت انہیں ایک ”رحم کی اپیل“ کا موقع دیا گیا تو اسے بھی ضائع کرنے کے باعث حتمی اور قطعی طور پر ذلت و مسکنت، اور لعنتِ خداوندی اور غضبِ الہی کے مستوجب ہو گئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جیسے کہ اس سے قبل تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے، ان کی اس آخری اور ”استیصالی“ سزا کی تنفیذ اس لئے مؤخر کر دی گئی کہ موجودہ امت مسلمہ کے افضل اور برتر حصے یعنی مسلمانانِ عرب پر عذاب اس مفضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں نازل کیا جائے تاکہ درد و الم پر توہین و تذلیل کا اضافہ ہو جائے۔ (جس کا آغاز پینچالیس سال قبل، یعنی ۱۹۳۸ء میں اسرائیل کے قیام کے وقت سے ہو چکا ہے اور جس

میں ”کتاب الملاحم“ میں وارد شدہ پیشینگوئیوں کے مطابق مستقبل میں حد درجہ شدت پیدا ہونے والی ہے!)

ربی موجودہ امت مسلمہ یعنی امت محمد ﷺ تو اس پرکلی اور مجموعی حیثیت سے تو یہ نام و نشان مٹا دینے والا عذاب ہرگز نہیں آسکتا۔ اس لئے بھی کہ یہ آخری امت ہے اور اسے تاقیام قیامت باقی رہنا ہے۔ (جیسے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں آخری رسول ہوں اور تم آخری امت ہو!“) اور اس لئے بھی کہ اس کا اصل جرم بے عملی یا بد عملی ہے، رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار نہیں! تاہم اس بے عملی و بد عملی اور بد عہدی و بیوفائی کی پاداش میں کسی مخصوص خطے اور علاقے سے اس کا نام و نشان مٹا دیا جانا ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے۔ چنانچہ ہسپانیہ کی تاریخ اس کا منہ بولا ثبوت ہے کہ وہ سرزمین جس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی، وہاں سے ”مٹے ٹاہیوں کے نشان کیسے کیسے؟“ کے مصداق اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹے پورے پانچ سو برس ہو گئے ہیں۔ فَاَعْتَبِرُوا يَا اُولٰٓئِیَ الْاَبْصَارِ!

ان سطور کے ناچیز راقم نے اب سے ساڑھے چھ سال قبل (جنوری ۱۹۷۷ء میں) اپنی تالیف ”استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ“ شائع کی تو اس کے ذیلی سرورق پر یہ الفاظ تحریر کئے تھے:

”۳۹ھ مطابق ۱۹۷۷ء میں اسلام بیک وقت بر عظیم ہند میں براستہ سندھ اور بر عظیم یورپ میں براستہ چین داخل ہوا تھا۔ چین سے اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہوئے پانچ سو برس ہو چکے ہیں۔ کیا اب وہی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی جائے والی ہے؟“

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے؟“

۔۔۔ اور آج راقم گہرے درد و رنج کے ساتھ یہ عرض کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پارہا ہے کہ ان ساڑھے چھ سالوں کے دورانِ وقت کے دریا میں جو مزید پانی بہہ گیا ہے اس کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان بلکہ پورے بر عظیم پاک و ہند میں اسلام اور مسلمانوں کے

مستقبل کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں!

اس لئے کہ ایک جانب اس تلخ حقیقت سے اختلاف کی کسی بھی شخص کے لئے ذرہ بھر گنجائش نہیں ہے کہ ہم نے ۱۹۷۱ء کے ”غذابِ ادنیٰ“ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اور ڈھاکہ کے سقوط، ملک کے دولخت ہونے، مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں قلبِ مابیت، اور ان سب پر مستزاد ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک اور ذلت آمیز شکست اور ترانوے ہزار مسلمانوں کی اسیری جن پر کہیں چھ سو، کہیں آٹھ سو اور کہیں ایک ہزار برس تک حکومت کی تھی (حضرت پر اندراج نامہ ص ۱) کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ ”ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا لیا ہے!“ کے نتیجے میں نہ ہماری قومی اور اجتماعی روش میں کوئی تبدیلی آئی، نہ ہی افراد کی ترجیحات یا مشاغل میں سرمو فرق واقع ہوا، بلکہ بحیثیت مجموعی ہم ہر اعتبار سے زوال اور اضطلال ہی کی جانب رواں دواں ہیں۔ چنانچہ ہمارا داخلی انتشار ہے کہ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے، تا آنکہ حالیہ سیاسی بحران کے دوران میں بعض دوسرے سیاسی اور قومی رہنماؤں کے اسی نوع کے بیانون کے علاوہ خان ولی خان کا یہ ”عزایاں“ بیان بھی شائع ہو چکا ہے کہ ”معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ختم ہو چکا ہے!“ اسی طرح معیشت ہے کہ تباہی کے آخری کنارے کو پہنچا چاہتی ہے۔ قوم کے منتخب نمائندوں کو اب ”بکاو گھوڑوں“ سے بڑھ کر ”لوٹوں“ کا نام دیا جا رہا ہے۔ حالیہ چمقلش کے ضمن میں صدر مملکت کو سرعام گالیاں دی گئیں اور ان کے نت نئے کارٹون اور کیری کیچر شائع ہوئے، اس سے بھی بڑھ کر عدلیہ پر کھلے بندوں فقرے چست کئے گئے حتیٰ کہ اعلیٰ عدالتوں پر پتھراؤ بھی ہوا۔ الغرض واقعتاً ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہم قومی اور ملکی اعتبار سے۔

”اس کی بریلوی پہ آج آلودہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جملہ کاف و نون“

کی حد کو پہنچ چکے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف بین الاقوامی سیاست میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ دنیا دو سپر پاورز کی کشاکش کی آماجگاہ ہونے کی بجائے ایک ”سول سپریم پاور“ کے حیطہ اقتدار میں آچکی ہے۔ چنانچہ اب کمزور قوموں اور چھوٹے ملکوں کے

options بہت محدود ہو چکے ہیں۔ اور اڑھارہم جس کی دوستی کا دم بھرتے رہے اور جس کی حمایت کے سارے جیتے رہے بلکہ جس کے گھڑے کی مچھلی بنے رہے (یعنی امریکہ) وہ نہ صرف یہ کہ ”آں قدح“ بنگلہ دہاں ساتی نہ ماندا“ کا مصداق کامل بن گیا ہے، بلکہ اب ہر اعتبار سے بھارت کو ترجیح دینے کی پالیسی کے ناطے ”جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگا!“ کا منظر آتم بن گیا ہے۔ اور صرف ہمارے لئے ہی نہیں، پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے اعتبار سے خطرناک ترین اور خوفناک ترین امر یہ ہے کہ اس ”سول سپریم“ اور ”آن ارتھ“ کی پالیسیوں کی تشکیل، اور فیصلوں کی تصحیح میں یہودیوں کو فیصلہ کن اثر و نفوذ حاصل ہے، جس کے نتیجے میں ”نیو ورلڈ آرڈر“ فی الواقع ”جیو ورلڈ آرڈر“ بن گیا ہے!

تیسری جانب بھارت میں متعصب ہندو ذہنیت کا جارحانہ احیاء ہے جس کی شدت نے دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی صورت اختیار کر لی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد لگ بھگ پچیس برس تک بھارت میں ہندو مت کے احیاء کے کوئی آثار نہیں تھے، بلکہ بھارت کی سیاسی اور سماجی زندگی پر انڈین نیشنل کانگریس کو فیصلہ کن غلبہ حاصل تھا جس میں اگرچہ متعصب اور کٹر ہندو بھی یقیناً شامل تھے تاہم اس کی قیادت میں فیصلہ کن عمل دخل سیکولر مزاج کے حامل لوگوں کو حاصل تھا۔ لیکن ۱۹۸۱ء میں پاکستان کے دو لخت ہونے کے باعث اس کے رعب اور دبہ میں جو کمی آئی اس سے بھارت میں عوامی سطح پر ہندو قوم پرستی کے جذبے کو تقویت ملی اور نہ صرف بھارت میں ہندو راشٹر کے قیام بلکہ پراچین بھارت کی عظمت رفتہ اور سطوت گزشتہ کی بازیافت کی امنگ پیدا ہوئی۔

اس جلتی پر تیل کا کام اس حادثے نے کیا کہ جب اتنی کی دہائی کے آغاز میں جری نس ہندی کے رد عمل میں مسلمان ووٹ بحیثیت مجموعی کانگریس کے خلاف پڑا تو اس پر ”جو اپ آں غزل“ کے انداز میں اگلے انتخابات میں اندرا گاندھی نے ”ہندو دیوی“ کا روپ دھار کر خالص ہندو ووٹ کے ذریعے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا۔ اور اس طرح بھارت میں ریاستی اور حکومتی سطح پر اور بالخصوص ذرائع ابلاغ کی وساطت سے ہندو فیزا مشلزم کو فروغ حاصل ہوا، جس کا نتیجہ سامنے ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) جو

راشریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے سیاسی فرنٹ کی حیثیت رکھتی ہے بھارت میں عظیم قوت بن کر ابھری ہے اور پوری ہندی نسل (راجپوتانہ، ہریانہ، اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور گجرات) میں تو غالب سیاسی طاقت بن ہی چکی ہے، اب جنوبی بھارت میں بھی قدم جملنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور خود آر ایس ایس کا حال یہ ہے کہ ایک جانب اب سے لگ بھگ دس برس قبل شکاگو سے جو ایک ضخیم تصنیف اس کے بارے میں "Brotherhood in Saffron" کے نام سے شائع ہوئی تھی اس میں اس کے تربیت یافتہ کارکنوں کی تعداد پچیس لاکھ بتائی گئی تھی۔ (اس پر اس عرصے میں جو اضافہ ہوا ہو گا اس کا اندازہ خود لگائیے!) دوسری جانب اس کی مستقل مزاجی کا عالم یہ ہے کہ ستر برس کے لگ بھگ عرصہ اس کے قیام کو ہونے کو آیا لیکن اس نے کبھی انتخابات میں شریک ہو کر "پاور پلینکس" میں وقت ضائع کرنا ہرگز گوارا نہیں کیا بلکہ ساری توجہ کو پوری تندی کے ساتھ اپنے کارکنوں کی تنظیم اور تربیت اور سماجی خدمت کے کاموں پر مرکوز رکھا (دراصل رہے کہ یہ جماعت قائم بھی خاکسار تحریک کے رد عمل ہی میں ہوئی تھی) اور تیسری جانب اس کے کارکنوں کے نظم و ضبط کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دسمبر ۱۹۹۲ء کے پہلے ہفتے میں ان کے تین لاکھ کارکن باہری مسجد کو گرانے کے لئے ایودھیا میں جمع ہوئے، اور ظاہر ہے کہ وہ بھارت کے کونے کونے سے طویل سفر طے کر کے آئے تھے، لیکن مسجد کے شہید کئے جانے تک کہیں ان کے کارکنوں کے مشتعل ہو کر کسی مسلمان کی جان، مال، یا عزت پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ چنانچہ اب بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور مستقبل کے اندیشوں کا اندازہ اس سے لگائیے کہ شدید ہے کہ اس عظیم تنظیم کے رہنما (گورو) دیورس نے حال ہی میں ایک عشتی مراسلہ بھارت کی تمام ہندو سیاسی، سماجی اور مذہبی تنظیموں کو ارسال کیا ہے جس میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ:

"اب ہمیں بھارت کی پاک زمین سے مسلمانوں کی نجات کو حتمی طور پر ختم کرنے کا آخری فیصلہ کرنا چاہئے۔ اور میں آپ سب کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اس پر کچھ معمولی سارو عمل پاکستان اور بنگلہ دیش میں تو ہو سکتا ہے، جس کی ہمیں پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں، باقی پوری دنیا کے مسلمانوں سے کسی ناموافق

رد عمل کا کوئی اندیشہ نہیں ہے!“

اندریں حالات بھارت کا مسلمان تو مسلسل خوف کی حالت سے دوچار ہے ہی (اس لئے کہ اسے تو مسلسل یہ نعرہ سننا پڑتا ہے کہ ”مسلمان کے دو استحقاق: پاکستان یا قبرستان!“) لیکن جگر کے اس شعر کے مصداق کہ۔

”آسودہ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں

ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفان ہوتے ہیں!“

ہم مسلمان پاکستان کو بھی کسی مغالطے میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ ایک جانب بھارت کے ہندو فضا مشلوم کا علاقائی حملہ اری کا دعویٰ انڈونیشیا سے افغانستان تک، معاشی استحصال کی انگلیں اس سے بھی آگے ایران و عرب تک، اور بحری بلادیستی کا عزم پورے بحر ہند پر یعنی آسٹریلیا سے افریقہ تک ہے! اور دوسری طرف بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ اور ہندو یہود کا اشتراک عمل بڑی خیزی کے ساتھ رسی اور روایتی سفارتی تعلقات سے بہت آگے بڑھ رہا ہے۔ اور اسرائیل اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے توسیعی عزم یعنی عظیم تر اسرائیل کے قیام کی راہ میں واحد مسلمان ملک جو مزاحم ہو سکتا ہے صرف پاکستان ہے، جس کے ایٹمی ذلت یا نکل چکے ہیں یا نکلنے کا اندیشہ ہے! اور تیسری جانب امریکہ وسطی ایشیا کی نو آزاد مسلمان ریاستوں کے سیاسی، معاشی یہاں تک کہ سماجی روابط بھی مغرب میں اسرائیل اور سیکولر ترکی اور مشرق میں بھارت کے ساتھ استوار کرانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ الغرض ”ان جملہ داخلی و خارجی عوامل کا“ حاصل جمع ”اقبال کے الفاظ میں یہ ہے کہ ”تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں!“ اور ہم بحیثیت ملک و قوم اس وقت بالکل اسی صورت حال سے دوچار ہو چکے ہیں جس کے پیش نظر بخت نصر کے ہاتھوں عظیم سلطنت اسرائیل اور مقدس شہر یروشلم کی کامل تباہی سے قبل انبیاء بنی اسرائیل اپنی قوم کو ان الفاظ میں متنبہ کرتے رہے تھے کہ: ”ہوش میں آ جاؤ، ورنہ جان لو کہ درخت کی جڑوں پر کھانا ڈال رکھا جا چکا ہے!“

ہماری نجات کا واحد ذریعہ:

اجتماعی توبہ

جو کچھ گذشتہ صحبت میں عرض کیا گیا تھا اس کے پیش نظر اس انگریزی مقولے کے مطابق کہ ”امید تو بہترین کی کرو، لیکن تیار بدترین کے لئے رہو!“ اس خطہ ارضی کے مستقبل کے بارے میں جس میں پاکستان واقع ہوا ہے، بہترین سے بدترین تک تین ممکنہ صورتیں نظر آتی ہیں:

پہلی صورت، جو نہایت خوش آئند اور تابناک ہے، یہ کہ۔

”پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود

پھر جہیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!“

کے مصداق ملتِ اسلامیہ پاکستان کو قومِ یونسؑ کی توبہ کی توفیق مل جائے۔ چنانچہ اولاً افراد و اشخاص کی ایک معتدبہ تعداد اللہ کے حضور میں سچی اور خالص توبہ کرے اور ایک جانب اپنے عقائد کی تصحیح کرے اور توحیدِ خالص کا دامن از سر نو مضبوطی کے ساتھ تھامے، دوسری جانب فسق و فجور کو ترک کرے اور اپنی معیشت اور معاشرت کو حرام اور منکر سے پاک کرے، اور تیسری جانب غلبہ اسلام اور قیام نظامِ خلافت کی منظم جدوجہد کے لئے تن من وھن وقف کر دے۔ ثانیاً اس طرح جو منظم قوت وجود میں آئے وہ ملکی سیاست اور اقتدار کی کشاکش سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے اپنی جملہ مساعی اور تمام تر توانائیوں کو مزاحمتی تحریک کے لئے وقف کر دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں فطری تدریج کے ساتھ ”باللسان“ یعنی زبان اور نشر و اشاعت کے دیگر ذرائع سے تدریجاً آگے بڑھ کر ”بالبدن“ یعنی قوت کے ساتھ مزاحمت کی راہ اختیار کرے۔ اور

اس طرح ارض پاکستان پر اللہ کے دین کو غالب اور اسلام کے نظام عدلی اجتماعی کو نافذ کر دے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نہ صرف یہ کہ قیام پاکستان کے لئے جو قربانیاں مسلمانان ہند نے دی تھیں وہ رائیگاں نہیں گئیں، بلکہ الف ثانی کی جملہ چار سو سالہ تجدیدی مساعی بھی بار آور ہو گئیں۔ اس لئے کہ اس صورت میں ارض پاکستان کو فوری طور پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گوارہ اور عالمی غلبہ اسلام کا نقطہ آغاز بننے کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کی دلی خواہش بھی یہی ہوگی کہ ایسا ہو جائے اور اسی کی دعا بھی ہر قلب کی گہرائی سے بلند ہوگی۔ اور ”جب تک سانس تب تک آس“ کے مطابق ہمیں آخری دم تک کوشش بھی اسی کی کرنی چاہئے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس کے کچھ ناگزیر لوازم و شرائط ہیں جن کا اجمالی ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے اور کسی قدر وضاحت سے آگے دوبارہ ہو گا۔

دوسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ چونکہ سرزمین مشرقی پاکستان ہم مغربی پاکستان کے رہنے والوں کی نگاہوں سے دور تھی اور ”آنکھ لو جھل پھاڑ لو جھل“ کے مصداق ۱۹۷۱ء کے ”عذاب ادنیٰ“ کے شدائد کو ہم نے براہ راست محسوس نہیں کیا لہذا شاید کہ ہماری آنکھیں کھولنے اور ہمیں توبہ اور رجوع پر آمادہ کرنے کے لئے ایک مزید ”عذاب ادنیٰ“ کی ضرورت ہو۔ چنانچہ جس عذاب کے سائے افق پر منڈلاتے نظر آرہے ہیں وہ عذاب ادنیٰ ہی کا ایک اور کوڑا ہو۔ اور اگرچہ اقبل کا یہ شعر کہ۔

”اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا“

تاحال ترکوں پر تو صادق نہیں آسکا، لیکن کیا عجب کہ ہم پر صادق آجائے!

تیسری اور آخری، اور حد درجہ قابلِ حذر صورت، جو بحالہ موجودہ ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے، یہ ہے کہ، ”خاکم بدین“ ہمیں اپنے کرتوتوں اور فروگزاشتوں کی پاداش میں اپنے کسی دشمن کے ہاتھوں عبرتاک سزا دلوائی جائے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ (قرآن کے الفاظ کے مطابق) ہمارے حلیے بگڑ جائیں بلکہ اس علاقے کا جغرافیہ ہی بدل

جائے اور عظیم سلطنت عثمانیہ اور عظیم سوویت یونین کے مانند، اور ”تسماری داستان“ تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں! کے مصداق ”سلطنت خدا واد پاکستان“ کا نام و نشان بھی دنیا کے نقشے سے حرف غلط کی طرح مٹ کر رہ جائے!

اللہ نہ کرے ایسا ہو، اور اگرچہ قرآن اور شولہ کے اقتدار سے تو اب معاملہ ایک انگریزی محاورے کے مطابق ”امید کے خلاف امید“ (Hoping against hope) کا ہے، تاہم مجھے اب بھی امید ہے کہ ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر خداخواستہ ایسا ہو گیا تب بھی میری یہ ”امید واثق“ اپنی جگہ برقرار رہے گی کہ عالمی غلبہ اسلام اور کُل روئے ارضی پر نظام خلافت علیٰ منہج النبوت کا قیام، جو تقدیر مبرم کے مانند اٹل ہے، اسی خطہ ارضی سے شروع ہوگا اس لئے کہ۔

”ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے

پاسہاں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!“

کے مصداق تاریخ اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے۔ اور جس طرح اب سے لگ بھگ سات آٹھ سو سال قبل اللہ تعالیٰ نے عربوں کو تاتاریوں کے ہاتھوں پڑایا، اور پھر خود ان کو اسلام کی توفیق عطا کر کے عالم اسلام کی قیادت سونپ دی، اسی طرح عین ممکن ہے کہ ہمارا کوئی دشمن ہمیں فتح کر لے لیکن پھر خود اسلام کے ہاتھوں مفتوح ہو جائے! اس لئے کہ بعض ایسے حضرات جن کی نگاہ ایک جانب تاریخ اور رفتارِ زمانہ پر بھی ہے، اور دوسری جانب قرآن اور دیگر کتبِ سلویہ کے علاوہ ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں پر بھی، یہ رائے رکھتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کی قیادت جو اولاً عربوں کو عطا کی گئی تھی جو حضرت نوحؑ کے بیٹے حضرت سام کی نسل سے تھے، پھر ترکوں کو منتقل کر دی گئی تھی، جو حضرت نوحؑ کے دوسرے بیٹے حضرت یافث کی نسل سے تھے، اب جنوبی ایشیا کے ان لوگوں کو منتقل ہونے والا ہے جو حضرت نوحؑ کے تیسرے بیٹے یعنی حضرت حام کی نسل سے ہیں۔ واللہ اعلم! بہر صورت، جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا، ہمارا فرض یہ ہے کہ۔

”سنبھلنے دے مجھے اسے ناامیدی کیا قیامت ہے

کہ دامنِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!“

کے مصداق دامنِ امید کو حتی الامکان مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے کی کوشش کریں، اور ”پوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ ۱ کے مطابق چین پاکستان میں ”چین سے روٹھی بہار“ کو واپس لانے کی ہر ممکن سعی کریں اور اس سلسلے میں قوم یونسؑ کی مثال ہمارے لئے بہت بہت افزا ہے۔ چنانچہ سورہ یونسؑ کی آیات ۹۶ تا ۹۸ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون تو یہی ہے کہ جس طرح کسی انسان پر موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی قوم پر آخری اور بڑے عذاب کے آثار شروع ہونے کے بعد اس کے ایمان لانے یا توبہ کرنے سے عذاب نہیں مٹا جاتا، لیکن اس قاعدہ کلیہ میں ایک استثناء کا معاملہ حضرت یونسؑ کی قوم کے ساتھ ہوا کہ ان کی توبہ عذابِ استیصال کے آثار شروع ہونے کے بعد بھی قبول کر لی گئی۔ تو اگرچہ قوم یونسؑ کے ضمن میں تو اس استثناء کا سبب کچھ اور تھا، تاہم چونکہ ہم پر فی الوقت کسی رسول کے ذریعے اتمامِ حجت نہیں ہوا ہے، لہذا ہم بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری سے استغاثہ کرنے کے مستحق ہیں اور توقع کر سکتے ہیں کہ اگر ہم سچی توبہ (توبہ نصوح) کا حق ادا کر دیں تو آنے والا عذاب ٹل سکتا ہے۔

البتہ کسی قوم کو دنیا میں اس ”رسوا کن عذاب“ سے نجات پا کر ایک نئی ”مسلّتِ حیات“ کی حقدار قرار دینے والی ”توبہ“ کے کچھ لوازم و شرائط ہیں جن کا فہم و ادراک ضروری ہے:

(۱) اولاً یہ کہ اگرچہ ”اجتماعی توبہ“ کا نقطہ آغاز لامحالہ انفرادی توبہ ہی ہوتی ہے، لیکن انفرادی توبہ کے ذریعے صرف اخروی عذاب سے نجات کی ضمانت مل سکتی ہے۔ اور وہ بھی صرف اس صورت میں کہ وہ واقعی ”توبہ نصوح“ ہو جس کی آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہؐ کی روشنی میں جو شرائط معین کی گئی ہیں وہ حقوق اللہ کے ضمن میں ہونے والی تقصیرات کے معاملے میں تو تین ہیں، لیکن حقوق العباد سے متعلق گناہوں کے معاملے

میں چار ہیں۔ یعنی ان دونوں قسم کے گناہوں کے ضمن میں تو یہ تین شرائط مشترک ہیں کہ: (۱) ایک یہ کہ حقیقی اور واقعی مذمت موجود ہو، بقول اقبال۔

موتی سمجھ کے شانِ کبریٰ نے جن لئے

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے!

(۲) دوسرے یہ کہ آئندہ کے لئے عزمِ مصمم ہو کہ اس گناہ کا ارتکاب کبھی نہیں کروں گا۔

اور (۳) تیسرے یہ کہ بالفعل بھی اس گناہ کو واقعتاً ترک کر دے۔ اور ان پر مستزاد حقوق

العباد کے ضمن میں ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ شخص متعلق کا جو حق تلف یا غصب

کیا تھا اس کی تلافی کرے، یا بصورتِ دیگر اس سے معافی حاصل کرے (اور نہ قیامت کے

دن حساب کتاب کے وقت ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی یا مظلوم کی برائیاں ظالم

کے حساب میں شمار ہوں گی۔)

(۲) یہ ”انفرادی توبہ“ خواہ کتنی ہی سچی ہو اور انسان ذاتی اعتبار سے خواہ کتنا ہی متقی و

صالح، اور عابد و زاہد کیوں نہ بن جائے، اگر قوم کی مجموعی حالت تبدیل نہ ہو اور وہ بحیثیت

مجموعی عذابِ خداوندی کی مستحق بن جائے تو جس طرح چکی میں گیسوں کے ساتھ گھن بھی

پس جاتا ہے اسی طرح جب کسی قوم پر دنیا میں اجتماعی عذاب آتا ہے تو اس کی پلیٹ میں

بدکاروں اور بد معاشوں کے ساتھ ساتھ بے گناہ لوگ بھی آجاتے ہیں جیسے کہ سورۃ

الافعال کی آیت ۲۵ میں فرمایا:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَلَا عِلْمُوا أَنَّ

اللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

(ترجمہ) ”اور ڈرو اس عذاب سے جو تم میں سے صرف بدکاروں اور گناہ گاروں

ہی پر نہیں آئے گا“ اور جان لو کہ اللہ مزادینے میں بہت سخت ہے!“

(اس قاعدہ کلیہ میں بھی ایک استثناء موجود ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے)۔۔۔ اس سے بھی

زیادہ قابلِ حذر معاملہ وہ ہے جو ایک حدیثِ مبارک میں بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

”اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کو حکم دیا کہ فلاں اور فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں

سمیت الٹ دو۔ اس پر حضرت جبرئیلؑ نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کہ پروردگار! اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی رہتا ہے جس نے آج تک کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی معصیت میں بسر نہیں کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الٹ دو اس بستی کو پہلے اس پر اور پھر دو سروں پر، اس لئے کہ (اپنی تمام تر ذاتی نیکی اور پارسلوں کے باوصف، اس کی دینی بے جھجکتی کا حال یہ ہے کہ میرے دین و شریعت کی حمیت و حفاظت میں کوئی عملی سعی و جہد تو درکنار) میری غیرت کے باعث کبھی اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر نہیں ہوا“ (سنن بیہقی)

(۳) دنیا میں کسی قوم کے اللہ کے عذاب سے بچنے کی واحد صورت ”اجتماعی توبہ“ ہے اور اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معاشرے کے صد فی صد لوگ تو کسی بھی دور میں درست نہیں ہوئے۔ (یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی آخر دم تک کچھ نہ کچھ تعداد میں منافق ضرور موجود رہے، تاہم دیگر اہل چہ رسد؟) تاہم اگر کسی قوم کے افراد اتنی معتد بہ تعداد میں سچی توبہ کر لیں کہ پھر اپنی دعوت و نصیحت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے قوم کے اجتماعی دھارے کا رخ تبدیل کر دیں، یعنی بالفاظ دیگر ایک اجتماعی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو جائیں، تو اس قوم کی جانب سے ”اجتماعی توبہ“ کا حق ادا ہو جائے گا۔ اور وہ ”دنیا کی زندگی میں رسوا کن عذاب“ سے نجات پا کر ”نئی زندگی“ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

(۴) چنانچہ کسی قوم پر اجتماعی عذاب نازل ہونے کی صورت میں اس کے نیک اور صالح افراد کے بچائے جانے کی وہ واحد استثنائی صورت جس کا ذکر اوپر کیا گیا تھا، اور جس کی امید قرآن حکیم میں سورۃ الاعراف کی آیت ۱۶۵ میں دلائی گئی ہے، یہی ہے کہ قوم کے اجتماعی فساد کی صورت میں جو لوگ آخر دم تک ”نہی عن السوء“ کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہیں، اور گویا سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ کے ان الفاظ مبارکہ کے مصداق بن جائیں: ”الْمُتَابِعُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِنُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ“

”فکر“ کے ساتھ قائم ہو۔ اس لئے کہ اس کے بغیر قوم کی اجتماعی صورت حل کا بدلنا ناممکن ہے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے احساس کے تحت علامہ اقبال نے اب سے لگ بھگ ساٹھ برس قبل ”فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید“ کے عنوان سے اپنے مشہور زمانہ ”خطبات“ ارشاد فرمائے تھے اور اسی ضرورت کے احساس کے تحت اب سے لگ بھگ تیس سال قبل حضرت علامہ ہی کے ایک ادنیٰ خوشہ چین کی حیثیت سے راقم الحروف نے ”رجوع الی القرآن“ کی تحریک شروع کی تھی۔ اس لئے کہ وہ بات جو مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے نہایت سادہ الفاظ میں کہی تھی، یعنی۔

”وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکھن فلسفہ سے

اُھوٹے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سپاروں میں!“

وہ فی الواقع ایک نہایت عظیم حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے امتِ مسلمہ کے جملہ امراض کا اصل سبب قرآن سے دوری کو قرار دیا اور اس کا اصل علاج ”رجوع الی القرآن“ تجویز کیا۔ چنانچہ سادہ ترین الفاظ میں تو ”جو اب شکوہ“ میں ارشاد فرمایا۔

وہ زمانے میں معتز تھے مسئلے ہو کر

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر!

اور نہایت پر شکوہ الفاظ میں ان فارسی اشعار میں بیان کیا کہ۔

خوار از مجوزی قرآن شدی

شکوہ پنج گردشِ دوراں شدی

اور۔

اے جو شبنم بر زمیں افتد

در بغلِ داری کتابِ زندہ!

یعنی ”اے امتِ مسلمہ“ تو درحقیقت تو خوار اور زبوں حال صرف اس لئے ہوئی کہ قرآن حکیم سے اپنا تعلق توڑ بیٹھی۔ گردشِ دوراں کے شکوے خواہ مخواہ کر رہی ہے۔ اے وہ قوم جو شبنم کی طرح زمین پر پڑی ہوئی ہے (چنانچہ اغیار و اعداء تجھے پامال کر رہے ہیں) اب

بھی اس ”کتاب زندہ“ کی جانب رجوع کر لے جو تیری بغل میں موجود ہے (تو تیرے تمام امراض و علل کا مداوا ہو جائے گا اور جملہ مسائل حل ہو جائیں گے۔) ”گویا جس طرح جبران خلیل جبران نے کہا تھا: ”عقل سے روشنی حاصل کرو“ اور جذبہ کے تحت حرکت کرو“ اسی طرح ہماری ”اجتماعی توبہ“ کا نسخہ یہ ہے کہ: ”قرآن سے ایمان حاصل کرو“ اور ایمان کے روغن سے چمد و عمل کی شمعیں روشن کرو!“

(۶) ایمان حقیقی کے لازمی اور منطقی نتیجے کو قرآن اکثر و بیشتر تو صرف ”عمل صالح“ کی نہایت جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے لیکن کہیں اس کے مضمرات اور متضمنات کو کھول بھی دیتا ہے۔ جیسے سورۃ العصر میں عمل صالح کے دو لوازم کو نمایاں طور پر بیان کر دیا یعنی ”حق کی علمبرداری اور دعوت و اشاعت“ اور ”باہم ایک دوسرے کو صبر و مصابرت کی تلقین و نصیحت“۔ اور اس طرح گویا ضمنی طور پر ایک جماعتی زندگی کی اہمیت کو بھی اجاگر کر دیا۔ اسی طرح کہیں قرآن ایمان کے جملہ عملی تقاضوں کو صرف ایک جامع اصطلاح ”جماد فی سبیل اللہ“ سے تعبیر فرما دیتا ہے، تو کہیں اس کی تفصیل و دخل اصطلاحات کے ذریعے کرتا ہے جیسے کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ میں تودہ نو اوصاف بیان ہوئے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور اس سے قبل آیت ۱۱۱ میں اضافی اصطلاح ”قتال فی سبیل اللہ“ کے ذریعے ”تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ“ کے مصداق دس اوصاف کی تکمیل فرمادی۔ اس معاملے میں بھی اس حقیقت کا اعتراف و اظہار ضروری ہے کہ بجز اللہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ میں بیان شدہ نو اوصاف میں سے بھی پہلے سات کا اہتمام تو بعض تصوف کے حلقوں کے علاوہ تبلیغی جماعت کے احباب بھی کر رہے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ۔

”نفل کر خلفاء ہوں سے اورا کر رسم شبیری“

کہ رسم خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری!“

کے مصداق یہ سب حضرات آخری دو اوصاف یعنی ”بدی سے روکنے اور حدود اللہ کے محافظ بن کر کھڑے ہو جانے“ کا بھی اہتمام کریں اور پھر اگر ”نبی عن المنکر

بِالْقَسَانِ" سے آگے بڑھ کر "نہی عن المتکرر بِالْبِدْ" کی عوامی تحریک کا مرحلہ بھی آجائے اور ضرورت داعی ہو تو فقہِ جانِ ہتھیایوں پر رکھ کر اور اللہ کے دین کی غیرت و حمیت، اور حمایت و محافظت میں جانیں قربان کر دینے ہی کو حاصلِ زندگی اور مقصدِ حیات سمجھ کر میدان میں آجائیں اور اس طرح "اجتماعی توبہ" کا وہ حق ادا کرنے کی کوشش کریں اور جو اس عذابِ الہی کے سایوں کو دور فرماوے جو وطنِ عزیز کے افق پر گہرے سے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔۔۔ آمین!

۲۶ جولائی ۱۹۹۳ء

ضمیمہ

اس کتاب میں مذکور

احادیث کی تخریج

زیر نظر کتاب میں جا بجا احادیث مبارکہ کے حوالے موجود ہیں، بلکہ بہت سے مباحث میں احادیث ہی کو استدلال کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ایسی تمام احادیث کو جو کتاب کے مرکزی مضمون سے براہ راست متعلق ہیں ان کے متون اور حوالہ جات سمیت یہاں ہم نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح احادیث مبارکہ کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار ہو گیا ہے۔

100

100-443618-100

[illegible]

قیامت سے قبل عالمی غلبہ اسلام کی نوید

عن المقداد رضی اللہ عنہ انه سمع رسول الله ﷺ يقول: "لا يبقى على ظهر الارض بيت مدر ولا وبر الا ادخله الله كلمه الاسلام يعز عزير و ذل دليل اما يعزهم الله فيجعلهم من اهلها او يذلهم فيدينون لها" قلت: "فيكون الدين كلمه لله" (رواه احمد في "المسند" بسند صحيح)

عن النعمان بن بشير رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: تكون النبوة فيكم ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها الله اذا شاء ان يرفعها ثم تكون خلافة على منهاج النبوة فتكون ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها اذا شاء ان يرفعها ثم تكون ملكا عاضا فتكون ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها اذا شاء الله ان يرفعها ثم تكون ملكا جبريا فتكون ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها اذا شاء ان يرفعها ثم تكون خلافة على منهاج النبوة ثم سكت (رواه احمد)

ان اول دينكم نبوة ورحمة وتكون فيكم ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها الله جل جلاله ثم تكون خلافة على منهاج النبوة ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها الله جل جلاله ثم يكون ملكا عاضا فيكون ما شاء الله ان يكون ثم يرفعها الله جل جلاله ثم تكون ملكا جبرية فتكون ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها الله جل جلاله ثم تكون خلافة على منهاج النبوة تعمل في الناس بسنة النبي ويلقى الاسلام بجرا انه في الارض يرضى عنها ساكن السماء وساكن الارض لاتدع السماء من قطر الاصبته مدرارا ولا تدع الارض من نباتها وبر كاتها شيئا الا اخرجه (بخاله "تجريد واحياء دين" از مولانا مودودي مرحوم)

علامات قیامت

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: بعثت انا والساعة كهاتين، كفضل احدهما على الاخرى وضم السبابة والوسطى (متفق عليه)

عن المستور بن شداد رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: بعثت في نفس الساعة فسبقتها كما سبقت هذه لهذه.... لاصبعيه: السبابة والوسطى (رواه الترمذی)

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال: بينما نحن جلوس عند رسول اللہ ﷺ ذات يوم اذ طلع علينا رجل..... قال: فاخبرني عن الساعة. قال: ما المسئول عنها باعلم من السائل. قال: فاخبرني عن اماراتها. قال: ان تلد الامه ربتها وان ترى الحفاة العراة العالة رعاء الشاؤ يتطاولون في البنيان (رواه مسلم)

عن ابي هريرة رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال: لا تقوم الساعة حتى يكثر فيكم المال ويفيض، وحتى يخرج الرجل بزكاة ماله فلا يجد احدا يقبلها منه، وحتى تعود ارض العرب مروجا وانهارا (رواه مسلم)

عن ابي هريره رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا تقوم الساعة حتى يحسر الفرات عن جبل من ذهب يقتتل الناس عليه، فيقتل من كل مائة تسعة وتسعون، فيقول كل رجل منهم لعلی اكون انا النجو (متفق عليه)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ قال: لا تقوم الساعة حتى ينزل فيكم ابن مريم حكما مقسطا فيكسر الصليب ويقتل الخنزير ويضع الجزية ويقيض المال حتى لا يقبله احد (رواه البخاري)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا تقوم الساعة حتى تطلع الشمس من مغربها فاذا رآها الناس آمن من عليها (متفق عليه)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا تقوم الساعة حتى تخرج نار من ارض الحجاز تضيئ اعناق الابل ببصري (متفق عليه)

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ قال: اول اشرار الساعة نار تحشر الناس من المشرق الى المغرب (رواه البخاري)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال: يادروا بالاعمال ستا: طلوع الشمس من مغربها، او الدخان، او الدجال، او الدابة، او خاصية احدكم، او امر العامة (رواه مسلم)

عن عوف بن مالک رضی اللہ عنہ قال: اتيت النبي ﷺ في غزوة تبوك وهو في قبة ادم فقال: اعدد متباين يذئ الساعة: موتى، ثم فتح بيت المقدس..... ثم فتنه لا يبقى بيت من العرب الا دخلته (رواه البخاري)

عن حذيفة بن اسيد الغفاري رضی اللہ عنہ قال: اطلع رسول اللہ ﷺ علينا ونحن نتذاكر فقال: ما تذاكرون؟ قلنا: (تذكر) الساعة. قال: انها لن تقوم حتى تروا قبلها عشر آيات فذكر الدخان، والدجال، والدابة،

وطلوع الشمس من مغربها، ونزول عيسى بن مريم، وياجوج وماجوج، وثلاثة خسوف: خسف بالمشرق، وخسف بالمغرب، وخسف بجزيرة العرب، وآخر ذلك: نار تطرد الناس الى محشرهم (رواه مسلم وابوداؤد والترمذي)

عن انس بن مالك رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: لا تقوم الساعة حتى يتقارب الزمان فتكون السنة كالشهر والشهر كالجمعة وتكون الجمعة كالיום ويكون اليوم كالساعة وتكون الساعة كالضربة من النار (رواه الترمذي)

عن انس بن مالك رضي الله عنه ان رسول الله ﷺ قال: "لا تقوم الساعة على احد يقول: الله الله" وفي رواية: "حتى لا يقال في الارض: الله الله" (رواه مسلم والترمذي)

عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: لا تقوم الساعة الا على شرار الناس (رواه مسلم)

عن ابي هريره رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: "ان الله يبعث ريحا من اليمن الين من التحرير فلا تداع احد في قلبه مثقال حبه من ايمان الا قبضته" وفي رواية: "مثقال ذره" (رواه مسلم)

قرب قیامت کی ہولناک جنگیں

عن ابي ابن كعب رضي الله عنه قال: اتي سمعت رسول الله ﷺ يقول: يوشك ان الفرات ان يحسر عن جبل ذهب فاذا سمع به الناس ساروا اليه فيقول من عنده: لئن تركنا الناس ياخذون منه ليدھبن به كله،

قال: فيقتتلون عليه فيقتل من كل مائة تسعة وتسعون (رواه مسلم)

عن ابي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: لا تقوم الساعة حتى يقاتل المسلمون اليهود، وراء الحجر والشجر، فيقول الحجر والشجر: يا مسلم يا عبدالله هذا يهودي خلقي فتعال فاقتله، الا الفرقد فانه من شجر اليهود (رواه مسلم)

عن ذي مخبر رضي الله عنه قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: ستصالحون الروم صلحا آمنا، فتغزون انتم وهم عدوا من ورائكم فتتصرون وتغنمون وتسلمون ثم ترجعون حتى تنزلوا بمرج ذي تلؤل، فيرفع رجل من اهل النصرانية الصليب فيقول: غلب الصليب، فيغضب رجل من المسلمين فيدقه، فعند ذلك تغدر الروم وتجمع للملحمة، زاد في رواية: ويثور المسلمون الى اسلحتهم فيقتتلون فيكرم الله تلك العصابة بالشهادة (رواه ابو داود في الملاحم)

عن عبد الله رضي الله عنه بن عمر رضي الله عنه قال: قال النبي ﷺ: "يوشك المسلمون ان يحاصروا الى المدينة حتى يكون ابعدهم سلاح" وعن الزهري سلاح قريب من خيبر (رواه ابو داود)

عن ثوبان رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: يقتل عند كثر كم ثلاثة كلهم ابن خليفة ثم لا يصر الى واحد منهم ثم تطلع الرايات السود من المشرق فيقتلونكم قتلا لم يقتله قوم، ثم ذكر شيئا لا احفظه فقال: فاذا رايتموه فبايعوه ولو حبوا على الثلج فانه خليفة الله المهدي (رواه ابن ماجه)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: اذا وقعت الملاحم بعث اللہ بعثا من الموالی ہم اکرم العرب فرسا واجودہ سلاحا یؤید اللہ بہم الدین (رواہ ابن ماجہ)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ینخرج من خراسان رایات سود فلایردھا شیئ حتی تنصب بایلیاء (رواہ الترمذی)

عن عبد اللہ بن الحارث رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ینخرج ناس من المشرق فیوطون للمہدی یعنی سلطانہ (رواہ ابن ماجہ)

حضرت مہدی کی شخصیت

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "لا تذهب الدنیا حتی یملک العرب رجل من اہل بیتی یواطی اسمہ اسمی" رواہ الترمذی، وابوداؤد وفی رواہ لہ: قال: "لولم یبق من الدنیا الا یوم لطول اللہ ذلک الیوم حتی یمت اللہ فیہ رجلا منی... او من اہل بیتی... یواطی اسمہ اسمی واسم ابیہ اسم ابی: یملا الارض قسطا وعدلا، کما ملئت ظلما وجورا"

عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا قالت: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: المہدی من عترتی من اولاد فاطمہ (رواہ ابوداؤد)

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: المہدی منی، اجلی الجہم، اقنی الانف، یملا الارض قسطا وعدلا، کما ملئت ظلما وجورا، یملک سبع سنین (رواہ ابوداؤد)

نزول عیسیٰ اور فتنہ و دجال

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: والذي نفسی بيده
ليوشكن ان ينزل فيكم ابن مريم حكما عدلا، فيكسر الصليب، ويقتل
الخنزير، ويضع الجزية، ويفيض المال حتى لا يقبله احد، حتى تكون
المسجدة الواحدة خيرا من الدنيا وما فيها (متفق عليه)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: كيف انتم اذا نزل ابن
مریم فيکم وامامکم منکم (متفق عليه)

عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: لا تزال طائفة من
امتی یقاتلون علی الحق ظاہرین الی یوم القيمة، فينزل عیسیٰ فيقول
امیرهم: تعال صلّ علينا، فيقول: لا، ان بعضکم علی بعض امراء تکرمة
اللہ هذه الامة (رواه مسلم)

عن مجمع بن جارية الانصاری رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ
يقول: يقتل ابن مريم الدجال بباب لد (رواه الترمذی)

عن النواس بن سمعان رضی اللہ عنہ قال: ذكر رسول اللہ ﷺ الدجال
فقال: ان يخرج وانا فيكم فانا حبيجة دونكم وان يخرج وليست فيكم
فامرء حبيجة نفس، واللہ خليفتي على كل مسلم، فمن ادركه منكم
فليقرأ عليه بفواتح سورة الكهف فانها حواركم فتنته قلنا: وما لبثه
في الارض؟ قال: اربعون يوما، يوم كسنة ويوم كسنة ويوم كجمعة
وسائر ايامه كايامكم قلنا: يا رسول اللہ هذا اليوم الذي كسنة

اتكفينا فيه صلوة يوم وليله؟ قال: لا! اقدروا له قدره، ثم ينزل عيسى بن مريم عليه السلام عند المنارة البيضاء شرقى دمشق فيدر كه عند باب لد فيقتله (رواه ابوداود وابن ماجه)

عن النواس بن سميان رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: كذلك! اذ بعث الله عيسى بن مريم فينزل عند المنارة البيضاء شرقى دمشق بين مهودتين واضع كفيه على اجنحة ملكين اذا طأ رأسه قطر واذا رفعه ينحدر منه جان كاللولؤ ولا يحل لكافر يجد ريح نفسه الامات ونفسه ينتهى حيث ينتهى طرفه فينطلق حتى يدر كه عند باب لد فيقتله..... (رواه ابن ماجه)

عن ابي امامة الباهلى رضي الله عنه قال: خطبنا رسول الله ﷺ فكان اكثر خطبه حديثا حدثناه عن الدجال وحذرناه فكان من قوله ان قال: "انه لم تكن فتنة فى الارض منذ ذرأ الله ذرية آدم اعظم من فتنة الدجال وان الله لم يبعث نبيا الا حذر امته الدجال وانا آخر الانبياء وانتم آخر الامم وهو خارج فيكم لامحالة..... فقالت ام شريك بنت ابي العكر: يا رسول الله افاين العرب يومئذ؟ قال: هم يومئذ قليل وجلهم ببيت المقدس وامامهم رجل صالح فبينما امامهم قد تقدم يصلى بهم الصبح اذ نزل عليهم عيسى بن مريم الصبح فرجع ذلك الامام ينكص يمشى القهقري ليتقدم عيسى يصلى بالناس فيضع عيسى يده بين كتفيه ثم يقول له: تقدم فصل فانها لك اقيمت فيصلى بهم امامهم فاذا انصرف قال عيسى عليه السلام: افتحوا الباب فيفتح ووراءه الدجال معه سبعون الف يهودى كلهم ذو سيف مجلى وساج فاذا نظر اليه الدجال ذاب كما يذوب الملح فى الماء وينطلق هاربا

و يقول عيسى عليه السلام: ان لى فيك ضربا لن تسبقنى بها، فيدركه عند باب اللّه الشرقى فيقتله، فيهزم الله اليهود، فلا يبقى شئ مما خلق الله يتوارى به يهودى انطلق الله ذلك الشئ لا حجر ولا شجر ولا حائط ولا ذابطة (الا لفرقه فانها من شجرهم لا تنطق) قال يا عبد الله المسلم هذا يهودى فتعال اقتله (رواه ابن ماجه)

عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: ينزل عيسى بن مريم الى الارض فيتزوج ويولد له ويمكث خمسا واربعين سنة ثم يموت فيدفن معى فى قبرى فاقوم انا وعيسى بن مريم فى قبر واحد بين ابى بكر وعمر (رواه ابن الجوزى فى "كتاب الوفاء")

نبى عن المنكر كى اھمیت

عن ابى سعيد الخدرى رضي الله عنه عن رسول الله ﷺ قال: من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فان لم يستطع فليسانه، فان لم يستطع فليقلبه، وذلك اضعف الايمان (رواه مسلم)

قال رسول الله ﷺ: اوحى الله عز وجل الى جبرائيل عليه السلام ان اقلب مدينه كذا وكذا باھلها، فقال يا رب ان فيهم عيدك فلانا لم يعصك طرفة عين، قال: فقال اقلبها عليه وعليهم، فان وجهه لم يتغير فى ساعة قط (رواه البيهقى)

دیگر متفرق احادیث

عن معاوية رضي الله عنه قال --- وهو يخطب --- سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا تزال من امتى امة قائمة بامر الله لا يضرهم من خذلهم ولا من

خالفهم حتى ياتي امر الله وهم على ذلك (متفق عليه)۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال: ان اللہ یبعث لہذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجد دلہا دینہا (رواہ ابوداؤد فی الملاحم)۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: اکثروا ذکر ہاذم اللذات الموت (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجہ)۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ: "ان ہذہ القلوب تصدأ کما یصدأ الحديد اذا اصابہ الماء"۔ قيل: یا رسول اللہ وما جلأ ہا؟ قال: "کثرة ذکر الموت وتلاوة القرآن" (روی البیہقی الاحادیث الاربعہ فی "شعب الایمان")۔

واللہ لتموتن کما تنامون ثم لتبعثن کما تستيقظون ثم لتحاسبن بما تعملون ثم لتجزون بالاحسان احسانا وبالسوء سوءاً وانہا لجنۃ ابداء اولنا رابداً (نہج البلاغۃ)

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) قال قال رسول اللہ ﷺ: "لَيَأْتِيَنَّ عَلَيَّ أُمَّتِي مَا أَتَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَدُّو النَّعْلِ بِالنَّعْلِ" (رواہ الترمذی)۔



مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرچشمہ یقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانی — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تا کہ اُمتِ مسلمہ کے فیہم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک پاہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبہٴ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ